مَیں مٹّی کی مُورت ہُوں

فہمیدہ ریاض

PDF BOOK COMPANY

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

فہمیدہ ریاض کی "بدن دریدہ" نے جو غدر مچایا اس کے نتیجہ میں وہ بے ضرر شاعرات کے جھرمٹ سے منفرد ہو کر متنازعہ شخصیت بن گئی۔ طہارت پسندوں کو مطعون، اخلاق پرستوں کو معتوب مگر سچے قارئین کی محبوب ــــ فہمیدہ ریاض معاصر شعراء میں معتبر نام قرار پائی۔ ابھی نزاعات کی گونج کم نہ ہوئی تھی کہ اپنے عصر سے اس کی کومٹ منٹ کا اظہار ایسی نظموں کی صورت میں ہوا جن میں الفاظ کی جگہ گویا کیکٹس استعمال کئے گئے تھے اور یوں نزاعات کی شدت اور آراء کی تلخی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ فہمیدہ ریاض یقیناً مضبوط اعصاب کی عورت ہے جو یہ سب سہہ گئی۔

فہمیدہ ریاض ملائیت، جبر اور گھٹن کی پیدا کردہ ذہنی پسماندگی کی فضا میں تخلیقی سفر طے کر رہی ہے۔ پاکستانی مردوں کے تنگ نظر معاشرہ میں فہمیدہ ریاض اپنی نسوانیت سے خوفزدہ ہونے کے برعکس اُسی کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنا کر اپنی شرائط پر زندگی بسر کر رہی ہے جو کہ بذاتِ خود بہت بڑا جہاد ہے۔

فہمیدہ ریاض کا باغیانہ لہجہ فیشن کی بنا پر نہیں کہ یہ شعورِ حیات کے ساتھ ساتھ شعارِ زیست بھی ہے۔ اس نے "بدن دریدہ" کے پیش لفظ میں لکھا تھا "شاعر ایک دیوار سے اپنا سر پھوڑتا ہوا خود کلامی کرتا ہے۔" چنانچہ "بدن دریدہ" کے بعد طبع ہونے والے مجموعوں "دھوپ"، "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟" اور "ہم رکاب" کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دیوار دریافت کر لی ہے اب وہ خود کلامی کے گنبدِ بے در سے باہر نکل آتی ہے اور اپنے عصر سے مکالمہ کر رہی ہے جس کے نتیجہ میں شاعری نے نوشتۂ دیوار کی صورت اختیار کر لی۔

خاموشی کے دور میں فہمیدہ ریاض فرضِ کفایہ ادا کر رہی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

مَیں مٹّی کی مُورت ہُوں

میں مٹّی کی مُورت ہُوں

فہمیدہ ریاض
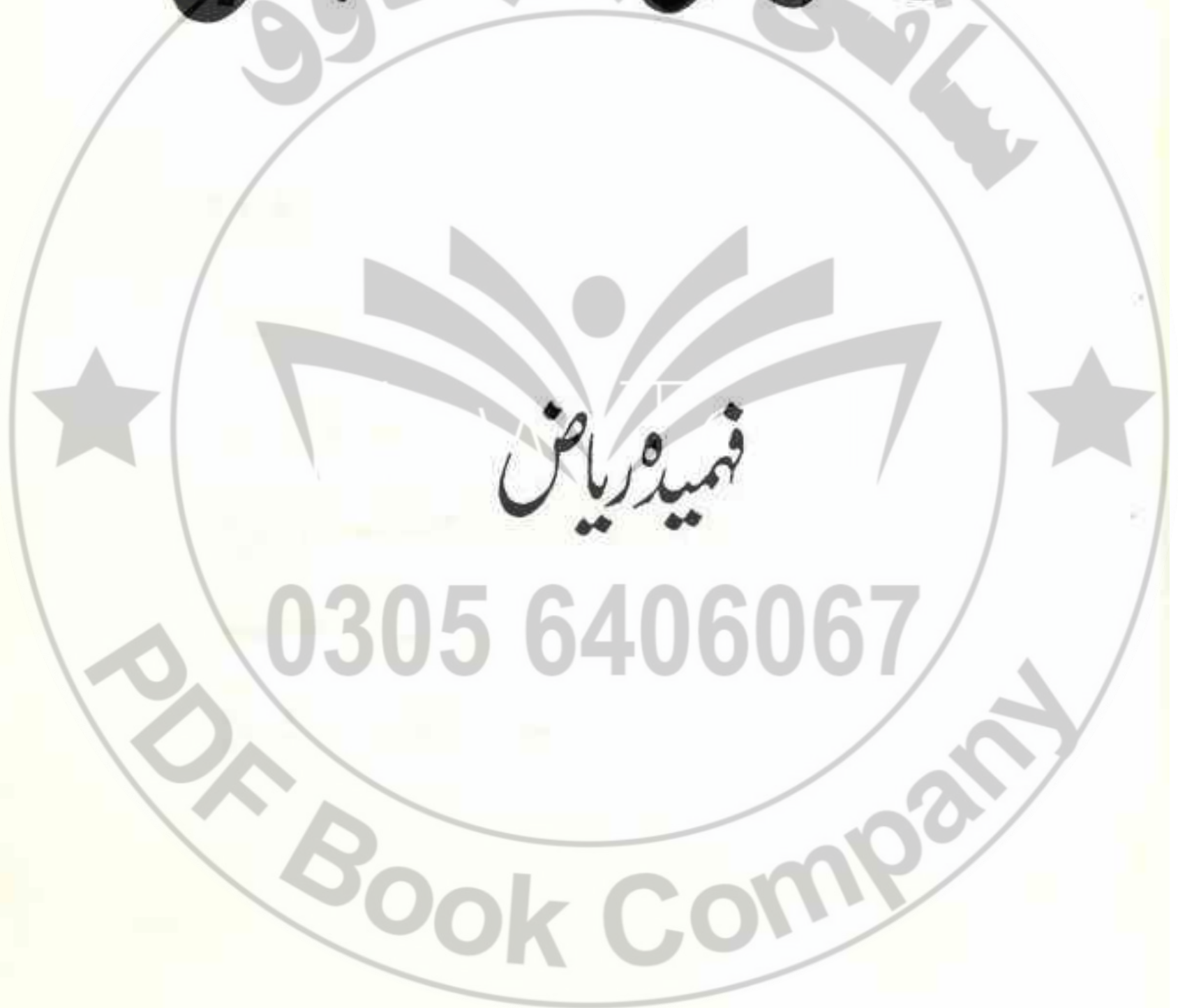
سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

۱۹۸۸ء

نیاز احمد

نے زاہد بشیر پرنٹرز سے

چھپوا کر سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

قیمت : ۱۵۰/۰۰ روپے

پتھّر کی زبان

ترتیب

پتّھر کی زبان

اسی اکیلے پہاڑ پر تُو مجھے ملا تھا
یہی بُلندی ہے وصل تیرا
یہی ہے پتّھر مری وفا کا
اُجاڑ، چٹیل، اُداس، ویراں
مگر مَیں صدیوں سے، اس سے لپٹی ہُوئی کھڑی ہُوں
پھٹی ہُوئی اوڑھنی میں سانسیں تری سمیٹے
ہَوا کے وحشی بہاؤ پر اُڑ رہا ہے دامن
سنبھالا لیتی ہوں پتّھروں کو گلے لگا کر
نکیلے پتّھر
جو وقت کے ساتھ میرے سینے میں اتنے گہرے اُتر گئے ہیں

کہ میرے جیتے لہُو سے سب آس پاس رنگین ہو گیا ہے
مگر مَیں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہُوں
اور ایک اونچی اُڑان والے پرند کے ہاتھ
تجھ کو پیغام بھیجتی ہُوں
تُو آکے دیکھے
تو کتنا خوش ہو
کہ سنگریزے تمام یاقوت بن گئے ہیں
دمک رہے ہیں
گلاب پتھّر سے اُگ رہا ہے

پتّھر کی زبان

اسی اکیلے پہاڑ پر تُو مجھے مِلا تھا
یہی بُلندی ہے وصل تیرا
یہی ہے پتّھر مری وفا کا
اُجاڑ، چٹیل، اُداس، ویراں
مگر مَیں صدیوں سے، اس سے لپٹی ہُوئی کھڑی ہُوں
پھٹی ہُوئی اوڑھنی میں سانسیں تری سمیٹے
ہَوا کے وحشی بہاؤ پر اُڑ رہا ہے دامن
سنبھالا لیتی ہوں پتّھروں کو گلے لگا کر
نکیلے پتّھر
جو وقت کے ساتھ میرے سینے میں اتنے گہرے اُتر گئے ہیں

کہ میرے جلتے لہُو سے سب آس پاس رنگین ہو گیا ہے

مگر مَیں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہُوں

اور ایک اونچی اُڑان والے پرند کے ہاتھ

تجھ کو پیغام بھیجتی ہُوں

تُو آکے دیکھے

تو کتنا خوش ہو

کہ سنگریزے تمام یاقوت بن گئے ہیں

دمک رہے ہیں

گلُاب پتّھر سے اُگ رہا ہے

سچ

سچائی، اُلفت، خودداری
مٹّی کے کمزور کھلونے
پل بھر میں ٹُوٹ جاتے ہیں

پھر بھی دُنیا کتنی حسیں ہے

ایسی مقدس — جیسے مریم
ایسی اُجلی — جیسے جُھوٹ

ذرا سی بات

پَل دو پَل کو، اِک محفل میں مِلے تھے، گئی بہار
اِدھر اُدھر کی سُنی سُنائی باتیں کیں دو چار
انھوں نے شاید دیکھا بھی تھا میری طرف اِک بار

جِھجک

یہ مری سوچ کی اَن جان، کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چُھپی
سر جُھکائے ہُوئے، کترا کے نکل جاتی ہے

ایک رات کی کہانی

بڑی سہانی سی رات تھی وہ
ہوا میں اَن جانی کھوئی کھوئی مہک رچی تھی
بہار کی خوش گوار حدّت سے رات گلنار ہو رہی تھی
روپہلے سپنے سے، آسماں پر سحاب بن کر بکھر گئے تھے
اور ایسی اک رات
ایک آنگن میں کوئی لڑکی کھڑی ہوئی تھی
خموش ـــــ تنہا
وہ اپنی نازک، حسین سوچوں کے شہر میں کھو کے رہ گئی تھی

دھنک کے سب رنگ اس کی آنکھوں میں بھر گئے تھے

وہ ایسی ہی رات تھی کہ راہوں میں اس کی، موتی بکھر گئے تھے

ہزار اچھوتے، کنوارے سپنے

نظر میں اس کی، چمک رہے تھے

شریر سی رات اس کو چپکے سے وہ کہانی سُنا رہی تھی

کہ آج

وہ اپنی چوڑیوں کی کھنک سے شرمائی جا رہی تھی

احتراز

آج کی رات کے دامن میں ہیں کیا کیا جادُو

خواب آلود فضاؤں میں یہ سوئے ہُوئے گیت
آپ کے قُرب کے احساس کی یہ نرم سی آنچ
کِسی اَن جان سی خواہش سے سُلگتا ہُوا چاند
کُچھ جھجکتی ہُوئی، شرماتی ہُوئی سرد ہَوا
(یہ مری سوچ کا اُلجھا ہُوا ریشم ڈورا)
نشّے میں جھُومتی شب کی طلب انگیز مہک
دھڑکنوں کو مری، بیدار کیے دیتی ہے
(دھڑکنیں، جن کا نہ حاصل ہے، نہ مفہوم کوئی)

اجنبی! آپ مجھے آنکھ جھپک لینے دیں،
رات کی سانس میں جذبات گُھلے جاتے ہیں
میری چوری کو مگر گھور رہی ہیں ہر سمت
دُور تک، روشنیاں، رات کی بانہوں میں اسیر
شہر کی سخت و سیہ، سوچتی، گونگی سڑکیں
ایسے جامد ہیں کہ جیسے مری قسمت کی لکیر

مَیں نے مانا کہ مجھے آپ کچُھ اپنے سے لگے
آپ کے گیتوں میں، اپنی مجھے آواز آئی
آپ کے حُسنِ تخیّل میں کھِلے ہیں وہ پھُول،
جن کی خوشبو سے معطّر ہے مری تنہائی
پھر بھی سوچیں تو مجھے آپ سے نسبت کیا ہے
کچّے دھاگے کا یہ بے نام سا اِک رشتہ ہے
یہ فسوں کار و جواں رات، فقط دھوکا ہے
صُبح اِک ایسی حقیقت ہے، نہیں جس سے گریز
کون اس رات کے دامن کو جکڑ سکتا ہے
لاکھ چاہیں بھی، پہ یہ رات گزُر جائے گی

اور پھر میری تمنّا کی یہ نورستہ کلی
اس حقیقت کی کڑی دُھوپ نہ سہہ پائے گی

جھلملاتے ہیں جو احساس میں ننّھے جگنو
وقت کی آنکھ میں رہ جائیں گے بن کر آنسُو
رات کی رات ہیں یہ رات کے سارے جادُو

سوچ

رات اِک رنگ ہے ، اِک راگ ہے ، اِک خوشبو ہے

مہرباں رات مِرے پاس چلی آئے گی
رات کا نرم تنفّس مجھے چُھو جائے گا
دُودھیا پھُول چنبیلی کے، مہک اُٹھیں گے
رات کے ساتھ مرا غم بھی چلا آئے گا

اب مرے خانۂ دِل میں بھی چراغاں ہو گا
یُونہی ہر شب جو پگھلتی ہے سیاہی شب کی
اِک لرزتا ہُوا سایہ سا چلا آتا ہے

جس کے سینے میں دھڑکتا ہے طلائی مہتاب
رات کے پیار میں گُم ذہن اگر یہ پُوچھے
"کون ہو تم، مرے مہمان، اندھیرے میں چھُپے؟"
چار اطراف بکھرتے ہُوئے سنّاٹے میں
میرے افکار یونہی گونج کے رہ جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے، نہیں اور کوئی بھی موجود
بے کراں رات میں گھُل جاتا ہے خود میرا وجود

مری چنبیلی کی نرم خوشبو

مری چنبیلی کی نرم خوشبو
ہَوا کے دھارے پہ بہہ رہی ہے
ہَوا کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے
ترا بدن ڈھونڈنے چلی ہے

مری چنبیلی کی نرم خوشبو
مجھے تو زنجیر کر چکی ہے
اُلجھ گئی ہے کلائیوں میں،
مرے گلے سے لپٹ گئی ہے

وہ رات کی کہر میں چھپی ہے
سیاہ خُنکی میں رچ رہی ہے
گھنیرے پتّوں میں سرسراتی
ترا بدن ڈھونڈنے چلی ہے

اب سو جاؤ

اب سو جاؤ

اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

تم چاند سے ماتھے والے ہو

اور اچھی قسمت رکھتے ہو

بچّے کی سی بھولی صُورت

اب تک ضد کرنے کی عادت

کچھ کھوئی کھوئی سی باتیں

کچھ سینے میں چُبھتی یادیں

اب انھیں بھُلا دو ــــــ سو جاؤ

اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

سو جاؤ ـــ تم شہزادے ہو

اور کتنے ڈھیروں پیارے ہو

اچّھا تو کوئی اور بھی تھی ؟

اچّھا ، پھر بات کہاں نکلی ؟

کچُھ اور بھی یادیں بچپن کی

کچُھ اپنے گھر کے آنگن کی

سب بتلا دو ـــ پھر سو جاؤ

اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

یہ ٹھنڈی سانس ہواؤں کی

یہ جھلمل کرتی خاموشی

یہ ڈھلتی رات سِتاروں کی

بیتے نہ کبھی ـــ تم سو جاؤ

اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

خوشبو

ٹپ ٹپ بُوندیں ، بے کل خواہش
ساون رُت چھائی ہے ہر سُو
آم کے پیڑوں سے آتی ہے
کوئل کی آوارہ کُو کُو

غم ، دھرتی کی سوندھی خوشبو
سوئی یادوں کو سہلائے
بیتی برساتوں کی گپھا میں
کھوئے کھوئے چھنکے گھنگرو

لہر لہر بے چین ہے ساگر
ساحل پیاسا ذرّہ ذرّہ

دیکھ کے بڑھتے ہاتھ تمھارے
لہرا اُٹھے رُخ پر گیسو

گھونگھٹ میں تڑپی چنگاری
بھٹکی باتیں، بہکی دھڑکن
سرگوشی میں اُلجھی سِسکی
ڈھلک گئے شانے پر آنسو

کانچ کی چُوڑی کے ٹکڑوں سے
دھیان میں بیٹھی کھیل رہی تھی
سمٹی سُن کر نام تمھارا
آئی گرم، حِنا کی خوشبو

کہیں سنہرا وصل نہ دمکے
ٹوہ میں رہتی ہے ساری دُنیا
بول نہ اُٹھیں دُشمن گھنگرو
بات کھُلے گی، مجھ کو مت چھُو

پچھتاوا

خُدائے ہر دو جہاں نے جب آدمی کو پہلے پہل سزا دی
بہشت سے جب اُسے نکالا
تو اس کو بخشا گیا یہ ساتھی
یہ ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ ہی آدمی کے قریں رہا ہے
تمام ادوار چھان ڈالو
روایتوں میں، حکایتوں میں
ازل سے تاریخ کہہ رہی ہے
کہ آدمی کی جبیں ہمیشہ ندامتوں سے عرق رہی ہے
وہ وقت جب سے کہ آدمی نے
خُدا کی جنّت میں شجرِ ممنوعہ چکھ لیا

اور

سرکشی کی

تبھی سے اس پھل کا یہ کسیلا سا ذائقہ

آدمی کے کام و دہن میں رہ رہ کر آرہا ہے

مگر ندامت کے تلخ سے ذائقے سے پہلے

گناہ کی بے پناہ لذّت

مالکس بے

لہروں کی آوازیں سُنتا
وُہ چپ چاپ چلا جاتا ہے
اُٹھتی گرتی آوازوں سے
بھُورا ساحل گونج رہا ہے

چاندی جیسا جھاگ اُڑاتی
بے کل لہریں ڈول رہی ہیں
ٹھنڈے، گیلے ساحل پر
اس کے آہستہ قدموں کے
ایسے نقش اُبھر آئے ہیں
جیسے اس کے لمس کے نیچے

نرم اور بات سمجھنے والی
ریت نے کہنا مان لیا ہے

ننّھے ننّھے، پیارے پیارے
نیلے اور گلابی پتّھر
ریت کے اندر جھلک رہے ہیں

سردِ ہَوا کا بھاری جھونکا
جو اس کا بچھڑا ساتھی ہے
پیار سے آکر گلے لگا ہے

اس کے ماتھے اور گردن پر
ریت کے ذرّے لگے ہوئے ہیں

بارش

جب بھی میرے آنگن میں
بوندیاں برستی ہیں
بند کر کے دروازے
بیٹھتی ہُوں کمرے میں
جانتی ہُوں یہ بوندیں
چاہتی ہیں جو مُجھ سے
چھت پہ وہ کریں ٹپ ٹپ
کھڑکیوں پہ ہو رِم جھم
مُجھ کو چھیڑنے کو یہ
کیسے رُوپ بھرتی ہیں
یا تو یُوں ٹپکتی ہیں

ہر طرف، گریں جیسے
آنسوؤں کے قطرے سے
اور کبھی دریچے پر
کھلکھلا کے ہنستی ہیں
ڈولتی ہواؤں میں
سنسنانے لگتی ہیں
ناچتی ہیں پتّوں پر
ڈال سے پھسلتی ہیں
کھڑکیوں کے شیشوں پر
جھانجھنیں بجاتی ہیں
پتّھروں پہ گاتی ہیں
دھیرے دھیرے سب دھرتی
سانس لینے لگتی ہے
ہر نفس مہکتا ہے
بند کر کے دروازے
بیٹھتی ہوں کمرے میں

پھر بھی ہاتھ بارش کے
مجھ کو ڈھونڈ لیتے ہیں
میرے رُوئیں رُوئیں کو
چھُو کے چھوڑ جاتے ہیں
ایک لرزشِ پیہم
اب کہاں چھُپوں جاکر
جانتی ہُوں یہ بُوندیں
میرے دِل پہ برسیں گی
میری کچّی مٹّی کو
چوم کر جگا دیں گی
اس کی سوندھی خوشبو پھر
مَیں کہاں چھپاؤں گی
لوگ ٹھیک کہتے ہیں
دو ہی ایسی چیزیں ہیں
جو کبھی نہیں چھُپتیں
ان میں ایک خوشبو ہے

یادیں

کُچھ لمحے ، جو جی اُٹھے تھے کبھی
جو دِل کی طرح دھڑکے تھے کبھی
کُچھ لمحے ! (جو اب مر بھی چُکے)
ان مُردہ لمحوں کی رُوحیں
احساس کے ویراں کھنڈروں میں
بے چَین بھٹکتی پھرتی ہیں

کبھی کبھی

اصولِ زندگی ہے یہ، حیات ہے تو آس ہے
دبیز ہوں سیاہیاں تو پھوٹے صبح کی کرن
چلی ہے جب بھی بادِ نامراد، جل اُٹھے چمن
سُلگ کے اس تپش سے اور بھی چمک اُٹھی لگن
وہ شوق کی خلش، کہیں جو دل کے آس پاس ہے
فراق، شدّتِ جنوں بھلا گھٹا سکا ہے کب
صعوبتوں کا سلسلہ بنا ہے جہد کا سبب
مہک اُٹھے ہیں حسرتوں کے پھول، بڑھ گئی طلب
مرے چراغِ شوق کو ہوائے تُند راس ہے

جو عزم ہے، اُمنگ ہے، تو ہم مُراد پائیں گے
جو اشک میں لہُو کا رنگ ہے تو گُل کھلائیں گے
کبھی تو اے خُدا! کبھی تو ہم بھی مسکرائیں گے

اسی یقین پر مری اُمید کی اساس ہے
مگر مَیں کیا کروں، کہ آج دِل بہت اُداس ہے

دِل دُشمن

عاقلوں نے فرمایا:

"دِل کی بات پاگل پن

جوشِ شوق دو اِک دِن

حُسن وعشق کم مایہ

آب و گِل کی دُنیا میں

سنگ جیسے دِل کر لو

خواب دیکھنے چھوڑ دو"

پھر بھی کیا کرے کوئی

دل میں ہُوک جب اُٹھے

یہ صدا نکلتی ہے:

ایک بار مل جائے
ہاتھ تھام لے آکر
صرف ایک لمحے کو
کیسی ہوگی وہ ٹھنڈک
میرے پیاسے ہاتھوں پر
اُس کے لمس کی شبنم
سارا درد دُھل جائے
یہ جو جاں سُلگتی ہے
اِس کو چین آ جائے
دل کے زخم کچّے ہیں
(دِل! سدا کا ضِدی دِل)
پھر بھی ٹھان لیتے ہیں
عاقلوں کی مانیں گے
یہ فضول سی باتیں
اب کبھی نہ سوچیں گے
(دل بھی کیسا دشمن ہے)

بس اِسی ارادے سے
درد کو دباتے ہیں
دِل تو پھر بھی دُکھتا ہے
نیند بھی نہیں آتی
بن گئی جلن ایسی
زندگی کی ویرانی
سُونی سُونی تنہائی
کروٹیں بدلتے ہیں
عاقلوں کے کہنے سے
درد بھی دبالیں گے
زخم بھی چھُپالیں گے
ہونٹ بھینچ کر اپنے
روکتے ہیں جب آنسُو
آنکھ میں کھٹکتے ہیں

اندیشہ

ہاتھ میں بیتی بات کی لرزش
لاکھ بچاؤں، کھنکے برتن
گُھٹی گُھٹی مجبوری میری
سب کے طعنے، دل کی کھولن
اُمیدوں کی راکھ میں دہکیں
جلتی حسرت کے انگارے
رُخ پر ڈھلکے عرقِ ندامت
کہنا چاہوں، چُپ رہ جاؤں
ہائے اس کی کھوئی محبّت
گال پہ کاجل پھیلا پھیلا

محرومی سے اُجڑی صُورت
رُسوائی سے آنچل مَیلا
چُھپکے چُھپکے آنسُو پُونچھوں
نہیں نہیں، مَیں روتی کب ہُوں
اس کا مُجھ کو دھیان کہاں ہے
مُجھ پر تم اُنگلی نہ اُٹھاؤ
یہ گیلی لکڑی کا دُھواں ہے

سردیوں کی ایک شام

اِک پیڑ کی اوٹ سے نکل کر
ڈوبا سرما کا زرد سُورج
مٹیالے بادلوں کے پیچھے
چُپ چاپ اُفق سُلگ رہا ہے
آوارہ ہَوا کا سرد جھونکا
بھٹکی سرگوشیاں سُنا کر
سُوکھے پتّوں سے کھیلتا ہے
خوشبوئیں گُھلی گُھلی اُداسی
ہر چیز کا رنگ سوچتا ہے
تنہائی کی شام جا رہی ہے

سینے کا بوجھ بڑھ رہا ہے
بیتی باتوں کی یاد بن کر
پہلا تارا لرز رہا ہے
جیسے مرے آس پاس کوئی
چُھپ کر ہچکی سے رو رہا ہے
آنسو آنکھوں میں چُبھ رہے ہیں
کوئی مرا دِل مَسل رہا ہے
کچّا رشتہ جو تجُھ سے ٹُوٹا
اب رُوح کا زخم بن گیا ہے
پتّھر بن کے مَیں سوچتی ہُوں
تُو میرے لیے نہیں بنا ہے
لیکن دِل کی اُداس دھڑکن
چُپکے چُپکے یہ کہہ رہی ہے
تُو میری رگوں میں رچ گیا ہے

تمنّا

مجھے تم سے ملنے کی اُمید کب ہے
مآلِ مسرّت کی تاریکیوں میں
نہیں خود فریبی کا کوئی اُجالا

مرا حوصلہ، سر کو زانو پہ رکھے
خجالت سے مُنہ آستیں میں چھپائے
بڑی دیر سے سسکیاں لے رہا ہے

کبھی آس کی پھانس دل میں چُبھی تھی
سو مُدّت ہُوئی، ٹُوٹ کر رہ گئی ہے
مرے دل میں اک پھُول اُمید کا تھا
اُسے وقت کے ہاتھ نے نوچ ڈالا

اب اس زخم سے تجربہ رِس رہا ہے
مری رُوح کی چیخ، اُبھرنے سے پہلے
لبوں پر مرے، منجمد ہو گئی ہے
مرے چار دِل اطراف غم کا دُھواں ہے

مگر ایک شعلہ بھڑکتا ہے دل میں
لپکتی ہُوئی جس کی خُونی زبانیں
مری رُوح کو چاٹتی جا رہی ہیں
یہ شعلہ ابھی تک یونہی ضوفشاں ہے

نہ اُمید کوئی، نہ کوئی سہارا
بغاوت کی ہمّت، نہ کوشش کا یارا
مری بے بسی مُجھ پہ ظاہر ہے، لیکن
تمھاری تمنّا، تمھاری تمنّا

زادِ راہ

طویل رات نے آنکھوں کو کر دیا بے نُور

کبھی جو عکسِ سحر تھا، سراب نکلا ہے

سمجھتے آئے تھے جس کو نشانِ منزل کا

فریب خوردہ نگاہوں کا خواب نکلا ہے

تھکن سے چُور رہیں، آگے بڑھیں کہ لَوٹ آئیں

چھُپے ہُوئے ہیں اندھیروں میں وسوسے کیا کیا

ہر ایک خضر پہ، رہزن کا شک گزرتا ہے

ہر آستین میں خنجر دکھائی دیتا ہے

پرے سرکتا ہی جائے گا کیا سحر کا اُفق؟

ہماری جراُتِ آغاز، بھُول تھی شاید!

ہمارے ہاتھ میں اُمید کا چراغ نہیں
یہ وُہ چراغ تھا، جس پر ہمیشہ رکھتے تھے
ہم اپنے سنگ سے، آہن سے، عزم کا سایہ
وُہی تو تھا دلِ خستہ کا ایک سرمایہ
خلوص اور یقیں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے
لُٹے ہیں ایسے کہ ہم اعتبار کھو بیٹھے

آخری بار

(بطرزِ مثنوی)

ہم جو یُوں پھر رہے ہیں گھبرائے

آخری بار اُن سے مِل آئے

یُوں گلے لگ کے ہو لیے رُخصت

اَن کہی بات کی مِٹی حسرت

جو بھی تنہائیوں میں سوچی تھیں

کھُل کے وہ ساری باتیں کہہ ڈالیں

اور جو کہنے سے تھی زباں لاچار

کہہ گئی چور، گرمیِ رُخسار

ظلمتِ غم میں دِل چراغ بنا
لالۂ رُخ پہ اشک داغ بنا

کہہ دیا چُپکے چپکے رو رو کے
ہار مانی ہے ہم نے دُنیا سے

سارے دعوے وفا کے ختم ہُوئے
ہم نہیں ایک دوسرے کے لیے

گھر کے قِصّے بیان ہوتے رہے
اپنی مجبوریوں پہ روتے رہے

جان کی دی قسم کہ شاد رہیں
اِلتجا کی کہ بھُول جائیں ہمیں

تھام کر ہاتھ، ان سے قول لیا
بیاہ کر لیں گے وہ کہیں اپنا

مِلے حسرت سے جُوں لبِ افسوس
رہ گئے اپنے اپنے دِل کو مسوس

جانتے تھے کہ اب نہ دیکھیں گے
یاس سے اُن کی شکل تکتے تھے

تھرتھراتے لبوں سے دے کے دُعا
عُمر بھر کے لیے وداع کیا
مگر اب تک یہ سوچ ہے دل میں
ان سے اِک بار اَور مِل آئیں

مجبوری

وصال و ہجر کی باتیں پُرانے قصّے ہیں
شکستِ دل تو بڑی عام سی کہانی ہے
نئے زمانے میں جذباتیت سے کام نہ لو
وہ اِک ذرا سی شرارت ہی کیا محبّت تھی؟
مجھے بتاؤ تو، سچ مچ یقین ہے تم کو!
پھر آپ مل نہ سکے آخری پیام کے بعد
ہمیں بھی صبر سا آ ہی گیا تھا رو رو کے
مگر جو گزری ہے دِل پر، وہ آپ کیا جانیں
سُنا ہے، پچھلے دنوں، دوستوں کی محفل میں
چلے تھے آپ کہ تردیدِ جُرمِ عشق کریں
مگر جھجک سے گئے کچھ ہمارے نام کے بعد

وہ لڑکی

جن پر میرا دِل دھڑکا تھا ، وہ سب باتیں دہراتے ہو
وہ جانے کیسی لڑکی ہے تم اب جس کے گھر جاتے ہو

مُجھ سے کہتے تھے، بن کاجل اچھی لگتی ہیں مری آنکھیں
تم اب جس کے گھر جاتے ہو، کیسی ہوں گی اُس کی آنکھیں
تنہائی میں چُھپکے چُھپکے نازک سپنے بُنتی ہُوں
تم اب جس کے گھر جاتے ہو، کیا وہ مُجھ سے اچھی ہو گی؟
مُجھ کو تم سے کیا دلچسپی، مَیں اِک اِک کو سمجھاتی ہُوں
یاد بہت آتے ہو جب تم، یُوں جُھوٹوں دِل بہلاتی ہُوں

اِک دِن ایسا بھی آئے گا، مجھ کو پاس نہیں پاؤ گے!
یاد آؤں گی، یاد آؤں گی، پچھتاؤ گے پچھتاؤ گے!
لیکن مَیں دُکھ درد سمیٹے، ان گلیوں میں کھو جاؤں گی
لاکھ مجھے ڈھونڈو گے لیکن ہاتھ تمھارے کیا آؤں گی

بیت چلی اُداس شام

بیت چلی اُداس شام
بُجھ گئی بادلوں کی آگ
پھیل گئیں سیاہیاں
ایک اندھیرے موڑ سے
روشنیاں ، گریز پا

کوئی نہ میری آرزُو
کوئی نہ دِل میں اشتیاق
کیوں مری خالی آنکھ میں
رنگ بھرے گا کوئی خواب

شام کا تارا دیکھ کر
مَیں نہ کِسی کا لُوں گی نام
میرے لیے کوئی نہیں
اجنبی ہیں یہ خوشبوئیں
اجنبی ہیں دھنک کے رنگ
شام کا تارا اجنبی،
اجنبی ہے ہَوا کا رنگ
سب کِسی اَور کے لیے

پچھلے پہر تک

چار سُو مَوت کا سکوت محیط
کوئی آہٹ، نہ کوئی گونج، نہ چاپ
آسماں دَم بخود، زمیں خاموش
اپنی کم مائیگی سے بے دل چاند
ہر ستارہ ہے دیدۂ بے نُور
برف سا سرد اور جامد وقت
زندگی جیسے پتھروں کا ڈھیر

اے مرے دِل! تجھے کہاں لے جاؤں
شب کا سیسہ پگھلنے والا ہے
مان بھی جا ـــــ وُہ اب نہ آئے گا

بیٹھا ہے میرے سامنے وُہ

بیٹھا ہے میرے سامنے وُہ
جانے کس سوچ میں پڑا ہے
اچھی آنکھیں ملی ہیں اُس کو
وحشت کرنا بھی آگیا ہے
بچھ جاؤں میں اس کے راستے میں
پھر بھی کیا اس سے فائدہ ہے
ہم دونوں ہی یہ تو جانتے ہیں
وہ میرے لیے نہیں بنا ہے
میرے لیے اس کے ہاتھ کافی
اس کے لیے سارا فلسفہ ہے

میری نظروں سے ہے پریشاں
خود اپنی کشش سے ہی خفا ہے
سب بات سمجھ رہا ہے لیکن
گُم سُم سا مجھ کو دیکھتا ہے
جیسے میلے میں کوئی بچّہ
اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے
اس کے سینے میں چُھپ کے رو دوں
میرا دل تو یہ چاہتا ہے
کیسا خوش رنگ پھول ہے وُہ
جو اس کے لبوں پہ کھل رہا ہے

یارب وہ مجھے کبھی نہ بھُولے
میری تجھ سے یہی دُعا ہے

لوری

ننّھے ننھّے ہاتھوں سے
مانگتے ہو کیا مُجھ سے ؟
ہم وَا دہن ، جیسے
کوئی اَدھ کِھلا غنچہ
مُجھ میں ڈھونڈتا کیا ہے
جسم میں تمھارے کیوں
میری رُوح کھِنچ آئی ؟
مُجھ سے کیسا رشتہ ہے ؟
کچھ بھی ہو مگر مُجھ کو
زندگی سے پیارے ہو

تم تو وہ مسرّت ہو
جس کو مَیں ترستی تھی
مَیں نے جو نہیں پائی
تم میں آ گیا شاید
حُسن میری حسرت کا

آرزُو کی رعنائی
تم کو دیکھ کر وہ بھی
آنکھ میں لیے حیرت
فخر سے، مسرّت سے
مُسکراتے لگتا ہے
تم میں لوگ پائیں گے
ثبت کوکھ پر میری
اُس کے پیار کا بوسہ
آج دیکھ لے دُنیا
کتنا خوبصورت ہے
میرے درد کا غنچہ

میری آنکھ کا آنسو

میرے خون کا قطرہ

تُو جو مُسکرائے گا

سب دُکھن بُھلا دُوں گی

زیست کی خلش لے کر

مَیں بھی مُسکرا دوں گی

گڑیا

چھوٹی سی ہے

اِس لیے اچھی لگتی ہے

بٹوا جیسے ہونٹ ہیں اس کے

اور رخساروں پہ سُرخی ہے

نیلی آنکھیں کھولے، بیٹھی تاک رہی ہے

جب جی چاہے کھیلو اس سے

الماری میں بند کرو

یا

طاق پہ رکھو اسے سجا کر

اس کے ننّھے لبوں پہ کوئی پیاس نہیں ہے
نیلی آنکھوں کی حیرت سے مت گھبراؤ
اسے لِٹا دو
پھر یہ جیسے سو جائے گی

لمبے سفر کی منزل

شام کے پھیلتے دھندلکے میں
جانے کب سے کھڑے ہُوئے ہیں ہم

سارے دِن کی تھکن سے پژمُردہ
کاوشِ بے حصُول پر نادم
گرد آلُود رُخ ــــ جُھکی نظریں
سرنگوں ــــ باادب ــــ بصد تکریم

پُشت پر زندگی کا بوجھ لیے
منتظر اپنے اپنے گاہک کے

چار سُو ہیں سنّاٹے

چار سُو ہیں سنّاٹے
ہر طرف ہے ویرانی
ذوقِ وصل کی اب تو
خاک بھی نہیں باقی
رہ گئی تھی اِک خواہش
مَیں نہ اس کو یاد آؤں
ایک تھی خلش دل میں
اس کو دُکھ نہ ہو کوئی
اے عزیز اندیشے
آ گلے سے لپٹا لوں
اس کے ساتھ تھا کوئی ؟
مُسکرا رہا تھا وُہ ؟

جب نیند بھری ہو آنکھوں میں

جب نیند بھری ہو آنکھوں میں، جب رات گئے بیلا مہکے
اور چار طرف ہو سنّاٹا، چُپ چاپ گزرتے ہوں لمحے
ایسے میں ہَوا کا جھونکا بھی پتّوں میں جو آہٹ کرتا ہے
مُجھ کو تو گماں یہ ہوتا ہے، جیسے وہ ہنسا آہستہ سے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، مَیں اپنا درد دباتی ہُوں
اور اُس آنسُو کو چھُپاتی ہُوں، جس کو مٹّی میں رلنا ہے
ایسے میں ہَوا کا جھونکا بھی پتّوں میں جو آہٹ کرتا ہے
مُجھ کو تو گماں یہ ہوتا ہے، جیسے وہ ہنسا آہستہ سے
آنکھیں موندوں، آنکھیں کھولوں، آنکھیں موندوں وہ پاس آئے
وُہ پاس آئے اور مجھ سے کہے "تم مُجھ کو اچھّی لگتی ہو"
آدھی سوئی، آدھی جاگی، پھر مَیں چُپکے سے ہنستی ہُوں
پھر مَیں چُپکے سے ہنستی ہُوں، دِھیرے دِھیرے سو جاتی ہُوں

قطرہ قطرہ

قطرہ قطرہ دِل میں آنسُو گرتے ہیں

اِک آنسُو اُس شخص کا، جو بے گانہ ہے
اِک آنسُو اُس نام کا، جو ہم لے نہ سکے
اِک آنسُو اُس دُعا کا، جو پُوری نہ ہُوئی
ایک فضول سی بات کہ جو بے سُود کہی
(آنسُو میرا خواب؟ مَیں جس سے گھبراؤں
آنسُو میری مُراد، جسے مَیں بہلاؤں)
اِک آنسُو اُس چہرے کا، جو یاد رہے
آنکھوں کے رَستے جو دِل میں اُتر جائے

اِک آنسو اُس ٹھہرے لہجے کا

اِک آنسو اُس وہم کا، ذہن میں جو آیا

اِک آنسو اس جھوٹ کا، جو اوروں سے کہا

پھیکی ہنسی سے کیسے قِصّہ ختم کیا

لمحہ لمحہ رات گزرتی جاتی ہے

قطرہ قطرہ دِل میں آنسو گرتے ہیں

مہمان

اُس کو اِک دن تو جانا تھا
مُجھ سے کیا رِشتہ، کیا ناتا
بس پَل دو پَل ٹھہرا تھا
پَل دو پَل ہنستے گزرا تھا

مَیں تب بھی سوچا کرتی تھی
یہ ساتھ بڑا لمحاتی ہے
جذبے کی تھوڑی سی گرمی
جلتے چھالے بن جاتی ہے

اس بات کو بیتے سال ہُوئے

پھر دُنیا ہے پہلے جیسی

سب رنگ وُہی ، رعنائی وُہی

سب حُسن وہی ، پر کیا کیجے

سچّے تھے مرے سب اندیشے

اب بھی ، یُوں ہی ، بیٹھے بیٹھے

یاد آئے تو دِل دُکھ جاتا ہے

کچھ لوگ

دُنیا کی لمبی راہوں پر ہم یُوں تو چلتے جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو یاد ہمیشہ آتے ہیں

وہ راہ بدلتے ہیں اپنی اور مُڑ کر ہاتھ ہلاتے ہیں
لیکن وُہ دِلوں کو، یادوں کی خوشبو بن کر مہکاتے ہیں

ایسے ہی سفر کرتے کرتے، اِک شخص ملا ہم کو بھی کہیں
دُنیا میں اچھے لوگ بہت، لیکن اُس کی سی بات نہیں

وُہ دھیمے لہجے والا تھا اور وُہ دھیرے سے ہنستا تھا
جتنے بھی لوگ مِلے ہم کو ، سچ جانو ، سب سے اچھا تھا

تھی لاگ نہ اس کے بولوں میں ، کی بات نہ کوئی لگاوٹ کی
اُس کے فقرے ٹوٹے ٹوٹے ، اُس کی آنکھیں کھوئی کھوئی

کہہ کر ہی نہ دے جو ہم چاہیں ، سوچا ہی کرے بیٹھا بیٹھا
پر دیکھے ایسی نرمی سے ، اِک بار تو ہو جائے دھوکا

گو ساتھ ہمارا خوب رہا ، اُس کو نہ ہُوئی پہچان بہت
گر بُوجھ لے دل کی بات کبھی ، ہو جاتا تھا حیران بہت

اور ہم اس کی حیرانی پر شرمندہ ہو کر رہ جاتے
کچُھ اور ہمارا مطلب تھا ، پھر دیر تلک یہ سمجھاتے

اب چہرہ اُس کا اُجلا ہو ، یا آنکھیں اس کی ہوں گہری
یا اس کے پیارے ہونٹوں کی ہر بات لگے ٹھہری ٹھہری

کچھ لوگ جو اچھے ہوتے ہیں، ور راہوں میں مل جاتے ہیں
ہیں اُن کو اپنے کام بہت، کب اپنا وقت گنواتے ہیں
کب پیاسے پیاسے رہتے ہیں، کب جی کو روگ لگاتے ہیں

دِل کی بات

اپنے دل کی بات کو ہم نے رات بہت سمجھایا
پہلو بدلے بستر میں اور دل کا درد دبایا
اب حیران کھڑے تکتے ہیں اس کی پیاری صُورت
اپنی بات گنوّا بیٹھے اور کچُھ بھی ہاتھ نہ آیا
جس کے دِل میں درد نہیں، ہم اس سے کیا کہہ بیٹھے
کیا چمکیلا موتی تھا، مٹّی میں جسے رِلایا
ہنگاموں میں اسے بھُلایا لیکن جب بھی لَوٹے
بوجھل قدم ہُوئے اور انجانے میں دل بھر آیا

تہنیت

کتنے بخت والے ہو
زندگی میں جو چاہا
تم نے پا لیا آخر
عزم اور ہمّت سے
فہم سے ذکاوت سے
ہے تمھارے دامن میں
پھُول کامرانی کا
اور تمھارے ماتھے پر
فخر کا ستارہ ہے
اب تمھارے چہرے پر

ایسی شادمانی ہے
کوئی کہہ نہیں سکتا

درد سے بھی واقف ہو
اور تمھارے پاؤں میں

دیر سے کھٹکتا ہے
آرزو کا اِک کانٹا

جس سے خُون رِستا ہے
لالہ زار راہوں پر

اس لہُو کی سُرخی کی
کانپتی لکیریں ہیں

ان لہُو کے دھبّوں میں
ناتمام، مبہم سی

ایک بات لکھی ہے

اپنے دوست کے لیے

یہ زرد موسم کے خُشک پتّے
ہَوا جنھیں لے گئی اُڑا کر
اگر کبھی ان کو دیکھ پاؤ
تو سوچ لینا
کہ ان میں ہر برگ کی نمو میں
زیاں گیا عرق ، شاخِ گُل کا
کبھی یہ سرسبز کونپلیں تھے
کبھی یہ شاداب بھی رہے ہیں
کھُلے ہُوئے ہونٹ کی طرح نرم اور شگفتہ
بہت دِنوں تک

یہ سبز پتّے
ہَوا کے ریلوں میں بے بسی سے تڑپ چُکے ہیں
مگر یہ اب خُشک ہو رہے ہیں
مگر یہ اب خُشک ہو چُکے ہیں
اگر کبھی اس طرف سے گزُرو
تو دیکھ لینا
برہنہ شاخیں ہَوا کے دل میں گڑی ہُوئی ہیں
یہ اب تمھارے لیے
نہیں ہیں

اس کا دِل تو اچھّا دِل تھا

ایک ہے ایسی لڑکی جس سے تم نے ہنس کر بات نہ کی
کبھی نہ دیکھا، چمکے اس کی آنکھوں میں کیسے موتی

کبھی نہ سوچا، تم سے ایسی باتیں وہ کیوں کہتی ہے
کبھی نہ سمجھا، ملتے ہو تو گھبرائی کیوں رہتی ہے

کیوں اس کے رُخسار کی رنگت سرسوں ایسی زرد ہُوئی
تم سے ملنے سے پہلے، وہ ایسی تنہا کبھی نہ تھی

مَل کر آنکھ بہانے سے، وہ کب تک آنسو روکے گی
اس کے ہونٹوں کی لرزش بھی تم نے کبھی نہیں دیکھی

کیوں ایسی سنسان سڑک پر اسے اکیلا چھوڑ دیا
اس کا دِل تو اچھّا دل تھا جس کو تم نے توڑ دیا

وہ کچھ نادم، وہ کچھ حیراں، رستہ ڈھونڈا کرتی تھی
ڈھلتی دُھوپ میں اپنا بے کل سایا دیکھ کے ہنستی تھی
اکثر سُورج ڈُوب گیا اور راہ میں اس کو شام ہُوئی

مُدّت سے ہے یہ عَالم دِل کا

مُدّت سے ہے یہ عالم دل کا، ہنسنا بھی نہیں، رونا بھی نہیں
ماضی بھی کبھی دِل میں نہ چُبھا، آئندہ کا سوچا بھی نہیں

وہ میرے ہونٹ پہ لِکھّا ہے جو حرف مکمّل ہو نہ سکا
وہ میری آنکھ میں بَستا ہے جو خواب کبھی دیکھا بھی نہیں

شامل ہے ہَوا کی آہوں میں وہ گیت، جو لب تک آ نہ سکا
میری ہر نظم کا عنواں ہے جو شعر ابھی لِکھّا بھی نہیں

چلتے چلتے کچُھ تھم جانا، پھر بوجھل قدموں سے چلنا
یہ کیسی کسک سی باقی ہے، جب پاؤں میں وہ کانٹا بھی نہیں

دھندلائی ہُوئی شاموں میں کوئی پرچھائیں سی پھرتی رہتی ہیں
مَیں آہٹ سُنتی ہُوں جس کی، وہ وہم نہیں، سایا بھی نہیں

تزئینِ لب و گیسو کیسی، پندار کا شیشہ ٹُوٹ گیا
تھی جس کے لیے سب آرائش، اُس نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں

جب سست قدم شب بیت چلی، ہولے ہولے نیند آ ہی گئی
سب افسوں وقت جگاتا ہے اور وقت کبھی ٹھہرا بھی نہیں

اِک حرفِ مُدّعا

اِک حرف تھا لبوں پہ، کھٹکتا تھا پھانس سا
اِک نام تھا زبان کا چھالا بنا ہُوا
لو مَیں زباں تراش کے خاموش ہو گئی
لو اب تو میری آنکھ میں آنسو نہیں کوئی
بس ایک میرا گُنگ — مِرا حرفِ مُدّعا

بدن دریدہ

ترتیب

غزلیں

پیش لفظ

میری نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہُوا تھا۔ نام تھا اس کا "پتھر کی زبان" موجودہ کتاب میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء تک کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ گویا یہ پچاس کے قریب نظمیں چھ برسوں پر محیط ہیں۔ آپ اسے "پتھر کی زبان" سے مختلف قسم کی کتاب پائیں گے۔ اس کے بعض موضوعات پر چند لوگوں کو بہت اعتراض ہے۔ اُن کے خیال میں یہ فحش ہیں یا چونکانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ آئیے پہلے تو ہم غور کریں کہ ہم لکھتے کیوں ہیں۔ تفریحِ طبع کے لیے؟ شہرت کے لیے؟ یہ درست نہیں ہے۔ دراصل شاعر ایک دیوار سے اپنا سر پھوڑتا ہُوا خود کلامی کرتا ہے۔ اس عمل میں صرف اس کا اپنا مکمّل وجود شامل ہے۔ اس کا دماغی اور جذباتی وجود، جسے اس کی رُوح نے ایسے گھیرا ہے جیسے سمندر کا پانی کسی جزیرے کو گھیرتا ہے۔ اس کی نظم پڑھنے یا سُننے والے اس عمل میں کہیں شریک نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو صرف اس حد تک کہ اس کی رُوح کی ارتقا میں سارے معاشرے کی اخلاقی اقدار حصّہ لیتی ہیں اور اس کے اُلجھاوے ان اقدار کے باہم ٹکراؤ اور تضاد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اِن تضادات میں شاعر تنہا نہیں اُلجھا ہوتا۔ جب اخلاقی اقدار اپنی حقیقی رُوح کھو کر محض رواج بن کر رہ جاتی ہیں تو اس کو ریزہ ریزہ ہوتے ہُوئے، بکھرتے ہُوئے معاشرے میں ہر فرد اپنے آپ کو اسی کرب کا شکار پاتا ہے۔ اسی خلفشار

یں وہ زندگی کرنے کی کوئی ترکیب نکالتا ہے۔ آخری عمر کو پہنچتے پہنچتے بیشتر لوگ مذہبی ہو جاتے ہیں یا ایسے کاموں میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی کوشش کرتے ہیں جن کا براہ راست ان کی روحانی کش مکش سے تعلق نہ ہو۔ مثلاً اپنے پیشے یا کاروبار کے لیے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں کچھ لوگ اپنے پیشے کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا کمہار جسے زندگی کی ساری خوبصورتی چاک پر گھومتے برتن میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسا ڈاکٹر جو لا علاج مرض کی دوا دریافت کرنے میں ساری عمر گزار دیتا ہے یا ایسا وکیل جسے قانون کی باریکیاں سمجھنے اور ان میں پوشیدہ سینکڑوں معانی کے بیان کرنے میں روحانی مسرت ملتی ہے۔ یہ سب زندگی کی معانی دینے کی کامیاب انسانی کوششیں ہیں اور ہر مرتبہ معاشرے کی گرتی ہوئی دیواروں کو ان کوششوں نے سہارا دیا ہے۔ ادیب، شاعر، فلسفی اور آرٹسٹ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہوتے ہیں مگر ان کا زندگی کرنے کا طریقہ ذرا مختلف ہوتا ہے وہ ایک جوش و خروش سے احتجاج کی صدا بلند کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے کبھی احتجاج کا نعرہ نہ لگایا ہو وہ کبھی یہ نہیں جان سکتے کہ یہ کیسی جگر خراش صدا ہوتی ہے کہ یہ نعرہ بلند کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ محسوس کرنے اور صدائے احتجاج کے لب تک آنے کے دَوران آدمی پہ کیا گزرتی ہے اس سے وہ واقف نہیں ہو سکتے۔ ہاں جب وقت وہ یہ صدا بلند کرتا ہے۔ وہ لمحہ جب وہ اپنے سینے میں گول گول، اپنے بدن کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی اس آواز کو آزاد کرتا ہے۔ بے شک سرخوشی کی انتہا کا لمحہ ہے۔ تب وہ اپنے آپ سے اُوپر اُٹھ جاتا ہے۔ جیسے شعلہ لپک کر بلند ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا جلال اور اس کا جمال دیدنی ہوتا ہے۔ یہی لمحہ جو آپ اپنی داد ہے اس کے تمام تر کرب کا صلہ ہے۔

معاشرے نے جو ادب اور آرٹ پیدا کیا ہے یہ وہی دیوار ہے اور وہی شوریدہ سر فنکاروں کا پیہم سر ٹکرانا۔ لیکن ایک سچائی اٹل ہے، وہ یہ کہ جب سر سلامت نہیں رہتے تو دیوار کیسے سلامت رہ سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑی کھوکھلی دیوار ہے اور بالآخر ٹوٹ جاتی ہے۔

کارگاہِ ہستی میں کس حسّاس ذی رُوح پر وُہ مقام نہیں آیا ہو گا جب اس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو۔ جب اُسے اپنے وجود کی قیمت نقدِ جاں سے نہ چکانی پڑی ہو لیکن جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جُھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنا دیں۔۔ آخری سانس تک جنگ کریں۔ سو مَیں نے بھی اپنی گردن جُھکی ہُوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں ایک رجز ہیں جنھیں بلند آواز سے پڑھتی ہُوئی مَیں اپنے مقتل سے گزری۔ اس لحاظ سے "بدن دریدہ" ایک رزمیہ ہے۔ اسے پڑھ کر اگر لوگ چونکے تو کیا بُرا ہُوا۔

فہمیدہ ریاض

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا!

غالبؔ

تصویر

میرے دِل کے نہاں خانے میں اِک تصویر ہے میری
خُدا جانے اُسے کِس نے بنایا، کب بنایا تھا
یہ پوشیدہ ہے میرے دوستوں سے اور مُجھ سے بھی
کبھی بھُولے سے لیکن مَیں اُسے گر دیکھ لیتی ہُوں
اُسے خود سے مِلاؤں تو مرا دل کانپ جاتا ہے

دِل سرد ہُوا

دل سرد ہُوا
اب شام حسیں
آئے بھی تو کیا
سینے میں کہیں
وہ درد نہیں
دن بیت گئے
مَیں نے اس کو
کب یاد کیا
آنکھوں میں مری
اس کی صُورت

دھندلا سی گئی

ہاں دل میں مرے

وہ عشق کی لَو

جو دائم تھی

کجلا سی گئی

اب دل ہے مرا

صحرا صحرا

معبود مرے

جس جا مَیں ہُوں

اُس جا کتنا

سنّاٹا ہے

عِشق، آوارہ مزاج

عِشق، آوارہ مزاج

وہ مُسافر تو گیا!

نہ کوئی اُس کی مہک ہے کہ جو دے اس کا پتہ

نہ کوئی نقشِ کفِ پا

نہ کوئی اس کا نشاں

کوئی تلخی بھی تہہِ جام نہ چھوڑی اُس نے

زندگی باقی ہے!

ایک سنجیدہ ہنسی

سوچ سی دل میں بسی

تیز آتی ہُوئی سانس

ذہن میں تھوڑے سے وقفے سے کھٹکتی ہُوئی پھانس
اور دُکھتا ہُوا دل
چوٹ تھی جس پہ لگی
چوٹ ویسی تو نہیں
درد باقی تو نہیں
لاکھ مانے نہ مگر
کچُھ پشیمان سا دِل
یوں بدل جانے پر
آپ حیران سا دِل
اس کو کیا اپنا پتہ
یہ ہے انسان کا دِل
کوئی پتھّر تو نہیں!
جس پہ مٹتی نہیں پڑ جائے جو اِک بار لکیر

کُندن

تپا ہُوا یہ چہرہ جیسے بادِ سموم سے جُھلسا پُھول
اور اس پر بھُوری آنکھوں کے دِیئوں کی لَو
دیکھنے والوں کے دل گرماتی ہے
بات بھی اس سے کرو تو جلتے دل کی آنچ سی آتی ہے

ہنسی میں چمک چمک اُٹھے دل کا کُندن
دُنیا مِٹا نہ پائی دِل کا بھولا پن
نہ کوئی یار نہ میت نہ اس کا ساجن ہے
شہرِ دل میں وہ رہے مگر بیراگن ہے
خوشی کے موتی پائے بھی تو کب ساتھ لیے
یونہی چل دی اپنے خالی ہاتھ لیے
جینے کا کوئی ڈھنگ نہ آیا خاک ہُوئی
اپنی آگ میں جل کر پگلی راکھ ہُوئی

مُرقّع

ہم نے دیکھی عجیب اِک ناری
سانوْلا رنگ ، جامنی ساری
اور باتوں میں ایسی چنچلتا
چُھوٹے رنگوں کی جیسے پچکاری
اُودی بندیا بھوؤں کے بیچ جڑی
اور بھویں رات کی طرح کاری
جیسے کالا ہرن ہو مدھُ بن میں
ایسی ہے اس کی آنکھ کجراری
لال ہونٹوں پہ ایسی مدرا ہے
ہو گئی جس سے سانجھ متواری

اس کی چمپا کلی گلے میں پڑی
گوری کلیوں کی جھولتی ڈاری

جیسے بدلی میں چاند لپٹے ہوں
ایسے کولہوں پہ گھومتی ساری

ہیں مدوّر خطوط سر تا سر
چھاتیاں گول اور گج بھاری

لال پتھّر کی لونگ ناک میں ہے
یا بھبوکا سی کوئی چنگاری !

دیکھو لوگو یہ نار ہے کر گھٹ
رنگ اور رُوپ سے بھری ساری

جُھکے آکاش جس سے ملنے کو
اسی ترل دھنک کی اک دھاری

خواب اور تعبیریں

شہر پہ کُہر ٹھہری ہُوئی !

کُہر میں شہر ڈُوبا ہُوا

جھیل کی سطح پہ پھیلتی

خُشک پیڑوں کی سُوکھی ٹہنیوں کے جھروکوں میں ٹھہری ہُوئی

میرے پَیروں تلے چرمراتے ہُوئے

کتھئی زرد نارنج پتّوں کے ڈھیروں پہ سوتی ہوئی

اور خزاں کے سلگتے ہُوئے شعلہ سال

سارے رنگوں کو دھیما بناتی ہُوئی

آنسوؤں میں بھگوتی ہُوئی دُھند میں

خواب ہیں

خواب ہیں

خواب میں

اے والی و ربِّ کون و مکان

ڈوب گئی خاموشی میں مغرب کی اذاں
کیسا سکوت ہے، والی و ربِّ کون و مکاں

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین
سب تعریف خُدا کی ہے جو ہے بہت عظیم
بارش سے نکھرا نکھرا شفّاف فلک

نیلا نیلا حدِّ نظر تک پھیلا ہے
سبزے کی مخمل سے ڈھکی ہے نرم زمیں
الحمد لِلّٰہِ ربّ العالمین
سب تعریف خُدا کی، جو ہے بہت عظیم

کیسی سوچ نے میرے دل میں چٹکی لی
کیسے دھیان سے میری آنکھیں بھر آئیں
سینے میں کیوں سناٹا سا چھایا ہے
یہ میرے سجدے میں تذبذب کیسا ہے
لب پہ دُعائیں آکے بنیں کیوں بے معنی
جیسے میرا اندر ہو سُنسان اُجاڑ
کوئی تو آئے کوئی تو آکر دستک دے
کیسے کھولوں اپنے دل کے بند کواڑ

برف باری کی رُت

یہیں تو کہیں پہ
تمھارے لبوں نے
میرے سرد ہونٹوں سے برفیلے ذرّے چُنے تھے
اسی پیڑ کی چھال پر ہاتھ رکھ کر
ہم اِک دن کھڑے تھے
یہیں برفباری میں ہم لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے
مہک تازہ بوسوں کی سر میں سمائے
ہم آغوشیٔ جسم و جاں کے نشے میں
گئی برفباری کی رُت
اور پگھلتی ہُوئی برف بھی بہہ گئی سب

یہاں کچھ نہیں اب
کہ ہر شے نئی ہے
ہٹا کر ردا برف کی گھاس لہرا رہی ہے
ہری پتیوں کی گھنی ٹہنیوں میں
ہوا جب چلے تو
گئے موسموں سے گزرتی
ہماری ہنسی گونجتی ہے

ابرِ بہار

بادِ صبا کے دوش پہ اُڑتے
کبھی برستے ابرِ بہار
جانے والے دنوں کا کچھ ہم کو بھی پتہ دو
ایسے ہی اُڑتے گئے زمانے کہاں پُرانے
ذرا بتا دو

بارش سے نکھری مٹی میں عطر بسا ہے
ذرّہ ذرّہ مہک رہا ہے
اس خوشبو کو

اس جادُو کو

کیسے اپنے دل میں بسا لوں

اس احساسِ بہار کو کیسے امر بنا لوں

وقت!

گزرتا وقت، کسی کے بس میں نہیں ہے

کوئی بھی چاہت، کوئی بھی آنسُو، اس کا دامن گیر نہیں ہے

مٹ جاتا ہے، لمحہ لمحہ

وقت کوئی تصویر نہیں ہے

حسرت سے تکتی جاؤں مَل مَل ہاتھ

منظر منظر اُڑتا جائے چھوڑ کے ساتھ

جس جھرنے پر ڈول رہی ہے

تیری میری جان کی کایا

اس جھرنے پر پتہ پتہ

بہتا جائے

کھوتا جائے

ہاتھ نہ آئے

ہاتھوں سے کب رُک سکتا ہے بہتا پانی

باقی ہے بس اس کی روانی

اسی میں اِک دن کھو جائے گی

لمحہ لمحہ بیت رہی ہے

بیت رہی ہے مری جوانی

میرے ہاتھ

دِل پر کب سے رِم جھم کرتی
کیسی برکھا برس رہی ہے
اس برکھا کے امرت رس سے
بھیگ چکی مَیں بھیگ چکی مَیں
مُکتی چھپتی دُھوپ اور بادل
یہ آکاش کے ننھّے بالک
کھیل رہے ہیں ہنّستے ہنستے
کلکاری بھرتے سبزے کو
شوخ ہَوا گدگدا رہی ہے
مَیں بھی اپنے پنکھ جھٹک کر
پَر تولوں اور بھروں اُڑانیں
اپنے بدن میں خود کھو جاؤں

یہ تن کا آکاش یہ دھرتی

دھیرے دھیرے پھیل رہے ہیں

اور مرے ہاتھوں کے پکھیرو

یہ چنچل بے چین پرندے

ایک انوکھے راز سے بے کل

دھرتی میں کچھ ڈھونڈ رہے ہیں

ڈھونڈ رہے ہیں ایسے پل کو

جس کی کھوج میں دل رہتا ہے

جس پل دھرتی ملے گگن سے

وہ پل میرے تن کے باہر

کہیں نہیں ہے کہیں نہیں ہے

یہ پنچھی، یہ نرم پکھیرو

جنموں سے دھرتی کے سنگی

اس کایا کے تال کنارے

دھیرے دھیرے ڈھونڈ رہے ہیں

کھوئے ہوئے پل کی کنکریاں

میگھ دُوت

سنسناہٹوں کے ساتھ
گڑگڑاہٹوں کے ساتھ
آگیا!
پَوَن رتھ پر بیٹھ کر
میرا میگھ دیوتا
دوش پر ہواؤں کے
بال اُڑاتا ہُوا
اس کا جامنی بدن

آسماں پہ چھا گیا
دُور تک گرج ہُوئی
زمیں دہلنے لگی
آسماں سمٹ گیا
بڑی گھن گرج کے ساتھ
ٹُوٹ کر برس پڑا
اور مَیں آنکھ موند کر
ہاتھ پسارے ہُوئے
دوڑتی چلی گئی
انگ سے لگا رہی
نیل اُس کے انگ کا

مَیں کہ بنتِ ہجر ہوں
مُجھ میں ایسی آگ ہے
مَیں کہ میرے واسطے
وصل بھی فراق ہے
میری ایسی پیاس ہے

میگھ رس میں بھیگ کر

ہانپتی کھڑی کھڑی

کہہ رہا ہے دل مرا

یہی ہے

مدھر مِلن کی گھڑی

سورۂ یاسین

یہ آخرِ شب کا سناٹا!

اس نیم اندھیرے رستے پر

جلدی میں قدم بڑھاتی ہُوئی

مَیں ایک اکیلی عورت ہُوں

بڑی دیر سے میرے تعاقب میں

اِک چاپ ہے جو چلی آتی ہے

گھر ــــ!

میرا گھر ــــ!

مَیں اپنے گھر کیسے پہنچوں

سوکھے حلقوم اور بیٹھتے دل سے سوچتی ہوں

شاید میں رستہ بھول گئی

یہ راہ تو میری راہ نہیں

اس راہ سے میں کب گزری تھی

سب گلیوں پر یہاں نام لکھے

اس گلی پہ کوئی نام نہیں

اور دُور دُور تک دم سادھے

یہ سارے گھر انجانے ہیں

لو پیلے چاند کا ٹکڑا بھی

کالے پتّوں میں ڈُوب گیا

اب کچھ بھی نہیں

بس میرے مُنہ میں خوف سے بھاری اور مفلوج زباں ہے

یا

تلوؤں سے اُوپر چڑھتی ہوئی

میرے انگ انگ میں رچی ہوئی

اِک خنکی ہے

میرے اور تمھارے بیچ

میرے اور تمھارے بیچ
اس نیلی چادر کے سوا کچھ بھی تو نہیں
پھر یہ اکیلا کہرا میرے دل پر کیسے اُتر رہا ہے
یہ گہرا سنّاٹا کیا ہے
ہر لمحہ کیوں سمٹ رہا ہے!
جو کچھ میرے دل میں ہے وہ رسموں کے رشتے سے ورا ہے
رسموں کا یہ رشتہ دیواروں سے ہم کو جھانک رہا ہے
گہرا سانس نہیں لے سکتی
مَیں بے چین ہُوئی جاتی ہُوں

بھیگی کالی رات کی بیٹی

اس کی آغوش میں کتنی گرمی ہے
مَیں کس طرح اس کی آغوش کو چھوڑ دوں
اس کے ہونٹوں کی مانوس خوشبو مجھے کر چکی ہے اسیر
اس کو معلوم کیا
میرے کمرے کے باہر بہت زور سے
میری کھڑکی پہ سر کو پٹکتی ہُوئی
چل رہی ہے جو سرما کی تیکھی ہَوا
گھر کے اُمڈی چلی آ رہی ہے جو پچھّم سے کالی گھٹا
گھور اندھیرے سے سینے میں گونجی ہے جو
بوندیوں کی صدا
ان سے بچپن کا میرا بڑا ساتھ تھا

باکرہ

آسماں تپتے ہُوئے لوہے کی مانند سفید
ریگ سُوکھی ہُوئی پیاسے کی زباں کے مانند
پیاس حلقوم میں ہے، جسم میں ہے، جان میں ہے

سر بہ زانو ہوں، جھلستے ہُوئے ریگستاں میں
تیری سرکار میں لے آئی ہُوں یہ وحش ذبیح!
مجُھ پہ لازم تھی جو قربانی وہ مَیں نے کردی

اُس کی اُبلی ہُوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک
اور سیہ بال ہیں بھیگے ہُوئے خوں سے اب تک
تیرا فرمان یہ تھا اس پہ کوئی داغ نہ ہو

سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا ان دیکھا بھی
بے کراں ریگ میں سب گرم لہو جذب ہُوا
دیکھ چادر پہ مری ثبت ہے اس کا دھبّا
اے خُداوندِ کبیر
اے جبّار!
متکبّر و جلیل!
ہاں ترے نام پڑھے اور کیا ذبح اسے
اب کوئی پارۂ ابر آئے، کہیں سایہ ہو
اے خُداوندِ عظیم
بادِ تسکیں! کہ نفس آگ بنا جاتا ہے!
قطرۂ آب کہ جاں لب پہ چلی آئی ہے

آڈن کے نام

یہ سچ ہے مرے فلسفی

میرے شاعر

وہ وقت آگیا ہے

کہ دُنیا کے بوڑھے فریبی معلّم کا جُبّہ پکڑ کر

نئے لوگ کہہ دیں

کتابیں بدل دو!

یہ جھُوٹی کتابیں

جو ہم کو پڑھاتے چلے آرہے ہیں

حقیقت کے رُخ سے

یہ بے معنی، فرسودہ لفظوں کے پردے ہٹا دو

جلا دو

کتابیں جو ہم نے پڑھی ہیں

جلا دو

کتابیں جو کہتی ہیں دُنیا میں حق جیتتا ہے

یہ سب کذب و بیہودہ گوئی مٹا دو

یہ سب کچھ غلط ہے

کہ ہم جانتے ہیں

کہ جھُوٹ اور سچ میں ہمیشہ ہوُئی جنگ

اور

جھُوٹ جیتا ہے

کہ نفرت امر ہے

کہ طاقت ہے برحق

کہ سچ ہارتا ہے

کہ شیطان نیکی کے احمق خُدا سے بڑا ہے

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

چھُو کے میرا بدن

اپنے بچّے کے دل کا دھڑکنا سُنو

ناف کے اس طرف

اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟

بس یہیں چھوڑ دو

تھوڑی دیر اور اس ہاتھ کو میرے ٹھنڈے بدن پر یہیں چھوڑ دو

میرے بے کل نفس کو قرار آ گیا

میرے عیسیٰ! مرے درد کے چارہ گر

میرا ہر موئے تن

اس ہتھیلی سے تسکین پانے لگا

اس ہتھیلی کے نیچے مرا لال کروٹ سی لینے لگا

انگلیوں سے بدن اس کا پہچان لو

تم اسے جان لو

چُومنے دو مجھے اپنی یہ اُنگلیاں

اُن کی ہر پور کو چومنے دو مجھے

ناخنوں کو لبوں سے لگا لوں ذرا

اس ہتھیلی میں منہ تو چھپا لوں ذرا

پھُول لاتی ہوئی یہ ہری انگلیاں

میری آنکھوں سے آنسو اُبلتے ہُوئے

ان سے سینچوں گی مَیں

پھُول لاتی ہوئی انگلیوں کی جڑیں۔ چومنے دو مجھے

اپنے بال، اپنے ماتھے کا چاند، اپنے لب

یہ چمکتی ہُوئی کالی آنکھیں

مرے کانپتے ہونٹ، میری چھلکتی ہُوئی آنکھ کو دیکھ کر کتنی حیران ہیں
تم کو معلوم کیا۔ تم کو معلوم کیا
تم نے جانے مجھے کیا سے کیا کر دیا
میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا۔
بیکراں تا کراں ایک انمٹ خلا
یُوں ہی پھرتی تھی مَیں
زیست کے ذائقے کو ترستی ہُوئی
دل میں آنسُو بھرے، سب پہ ہنستی ہُوئی
تم نے اندر میرا اس طرح بھر دیا
پھُوٹتی ہے مرے جسم سے روشنی

سب مقدّس کتابیں جو نازل ہُوئیں
سب پیمبر جو اَب تک اُتارے گئے
سب فرشتے کہ ہیں بادلوں سے پرے
رنگ، سنگیت، سُر، پھُول، کلیاں، شجر
صُبحدم پیڑ کی جھومتی ڈالیاں
اُن کے مفہوم جو بھی بتائے گئے

خاک پر بسنے والے بشر کو مسرّت کے جتنے بھی نغمے سُنائے گئے
سب رشی، سب مُنی، انبیا، اولیا
خیر کے دیوتا، حُسن، نیکی، خُدا —
آج سب پر مجھے
اعتبار آگیا۔ اعتبار آگیا

میرے لال

سوتا رہ !

میرے لال

میری گرم کوکھ میں

سوتا رہ !

کتنی دُور دُور تک

پھیل گئی جڑ تری

اور بہت گہری

اور بہت گہری

سارے تن میں تو ہے

میرے لال

میرے لال

سوتا رہ !

دیکھ مرے اندر

بہت گھنا

بہت بڑا

روتا ہُوا جنگل

اس سیاہ بن میں

ایسے آگیا تو

کوئی ناگ جیسے

نرم جلد والا

سُرخ جلد والا

پھرے سرسراتا

اُس اُداس بن میں

تجھے کون لایا

اس اُجاڑ گھر کو

تُو نے کیوں بسایا

میرے لال

میرے لال!

آکاس بیل

تو ہری بھری
آکاس بیل
مرے تن سے لپٹ کر بڑھے

اور بوند بوند
مرے انگ سے
جیون رس پیتی جائے

مُرجھا چلی میں
جیسے سوکھا پات
تو جیسے جیسے کھلی

پڑ گئی زرد

مری سب لالی

ترے مُکھ گلاب کو ملی

مجھے رات کی کالک ملی

تجھے بھور کا پرکاش

مَیں گڑی جاؤں پاتال میں

تجھے کھینچ رہا آکاش

مت نیند سے چونک کے دیکھ مجھے

مَیں تجھے چھاتی سے لگاؤں

اور کانپتی انگلیوں سے

ترے کالے بال سُلجھاؤں

اِس قدر تر و تازہ

اس قدر تر و تازہ !

تال کا کنوّل جیسے

چاندنی سجل جیسے

جیسے پھُوٹتی کونپل

جیسے جھاگ سا بادل

چھُو بھی لوں تو میلی ہو !

آ ہُمک کے بانہوں میں

تجھ کو گود میں بھر لوں

چوس لوں گی رس تیرا

مَیں تو کالا بھونرا ہُوں

پر مَیں اپنے بوسوں سے

کس لیے ہراساں ہُوں

دل کی تھاہ میں میرے

جو اُداس جذبہ ہے

اس سے کیوں ہُوں شرمندہ

دُوجا سایہ

تُو مری گود میں کِھل کِھل ہنستی چمپے کی سی کلی سہی
تیری جان کی ساری کایا میری کوکھ میں ڈھلی سہی
اس کمرے میں ہم تنہا ہیں یہ دُوجا سایہ کس کا ہے
بار بار کیوں تیرا چہرہ تاریکی میں کھو جاتا ہے
کیسا دوہری دھار کا خنجر پلنے کی ڈوری سے بندھا ہے
جس میں میرا لہُو رچا تھا، اس تن پر کیوں لرز رہا ہے

لوری

کب سے سر پر تنی کھڑی ہے
کہیں نہ جاتی
کالی رَین
آدھی رَین

پاگل تن کیوں کھوج رہا ہے
کھوج رہا ہے اندھیارے میں
اپنے انگ سے ٹوٹا انگ
ٹوٹے انگ کی مانگ جگاتی
کہیں نہ جاتی
کالی رَین
آدھی رَین

مَیں جنگل کا مور بنی ہُوں
آنسُو پی کر ناچ رہی ہُوں
یونہی رہے سر پر منڈراتی
کہیں نہ جاتی
کالی رین
آدھی رین

میرے سینے کے پیالوں میں
ناچ رہی ہے دُودھ کی دھارا
میری کوکھ میں گونج رہی ہے
سن سن کرتی
کالی رَین
آدھی رَین

کب تک

کب تک مجھ سے پیار کرو گے
کب تک ؟
جب تک میرے رحم سے بچّے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس سے آگے بھی تو کچھ ہے
وہ سب کیا ہے
کسے پتہ ہے
وہیں کی ایک مسافر میں بھی
انجانے کا شوق بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے تب تک

بدن دریدہ

سرسرانے دو ذرا رات کے اس ریشم کو
اس میں ملفوف کسی عہد کی اِک لاش بھی ہے
رات جو جرم بھی ہے جرم کی پاداش بھی ہے
رات پانی کی طرح سر سے مرے بہتی ہے
مرے بالوں سے ٹپکتی ہُوئی بوندیں جیسے
مرے شانوں سے ڈھلکتی ہُوئی گرتی جائیں
بند ہونے لگیں آنکھیں وہ نشہ طاری ہے

ہاں دہن میں ہے مرے ذائقہ اُن بوسوں کا
جن کو چکھنے سے بھی انکار کیا تھا دِل نے
میری رگ رگ میں وُہ سیّال رواں ہے اب تک
جس سے بچ جانے پہ اصرار کیا تھا دِل نے

مرے اطراف پتنگوں کی طرح اُڑتے ہیں

مرے بوسے ، وہ مرے جھوٹ سے بوجھل بوسے

خون کی چھینٹیں اُڑاتے ہُوئے گھایل بوسے

کب کی وہ کشمکشِ ذہن و زباں ختم ہُوئی

اِک تڑپ باقی تھی سو دُشمنِ جاں ختم ہُوئی

اب تو وہ میری تھکاوٹ بھی مجھے چھوڑ چکی!

اِک سیہ لہر بہائے لیے جاتی ہے مجھے!

خوں روانی سے بدن چھوڑ رہا ہو جیسے !

نیند ہے موت ہے یا یہ کوئی بے ہوشی ہے

اب تو ہر سانس دمِ بازپسیں لگتی ہے!

زمین دوز ریل میں

اور اب ، جب مرے پہلو میں نہیں کوئی نفس
آشنا ، دوست ، شناسا ، مری دُنیا کے مکیں
رہ گئے ہیں کہیں دُور

اور
مرے پہلو میں
مری دُز دیدہ ، دبی آہ کو سُننے والا
چونکنے والا ، یہاں کوئی نہیں
اب نہ روکو اُسے ، آزاد تصوّر کو کرو
ذہن کو سوچنے دو
اور تخیّل کو بھٹکنے دو ذرا

ایسی باتیں، جنھیں سوچو تو نشہ آجائے
ایسے امکان کہ جینے کا مزا آجائے
ایسی باتیں کہ نہیں جن کی اجازت تم کو
ذہن کو سوچنے دو
یہ تو کچھ جرم نہیں
یہ تو نہیں کوئی گناہ
اور اگر ہے بھی تو پوشیدہ ہے

آؤ

آؤ!

آؤ

یہ سحر جو مجھ میں سمایا ہے

یہ سحر، جو تم کو بھایا ہے

کیا کھینچ نہ لائے گا تم کو

میرے پہلو میں بٹھانے کو

اس گونج کے چکراتے لہراتے بھنور میں دھوکا کھانے کو

اور مجھ سے آٹکرانے کو

مَیں تپتی دھوپ میں اپنے بدن کا آئینہ چمکاتی ہوں

تم آؤ گے

آئینے سے ٹکراؤ گے

اور پیشانی پر زخم لیے رہ جاؤ گے

مَیں گاتی ہُوں

اور آئینہ چمکاتی ہُوں

اِک اندھے جادُو کے بس میں

ہر لمحہ تمھیں بُلاتی ہُوں

عشق، تم جس کی تمنّائی تھیں

عشق، تم جس کی تمنائی تھیں
کسی فردوس کا خوش رنگ پرندہ تو نہ تھا
یہ ہے تاریخ سے پہلے کا وہ اندھا عفریب
جو میرے جسم میں دُر آیا ہے
یہ درندہ جو میرے جسم کی دیواروں کو
اپنے آلودہ و نم ہاتھوں سے سہلاتا ہے
اندھے ہاتھوں سے جو ہر لحظہ مجھے چھُوتا ہے
گرم سانسیں جو شب و روز بھرے جاتا ہے

بھاری پیکر بہت آہستہ سے جنبش ہے مگر
مجھ کو معلوم ہے کس جست کی ہے اس میں تڑپ
بڑی محتاط، بہت آہستہ
اُنگلیاں پھیر رہا ہے کہ نشاں پائے کوئی
ڈھونڈتا ہے کوئی دروازہ، کوئی راہ ملے

وصل اِک کرن بن کر

وصل اِک کرن بن کر
رُوح میں دمکتا ہے
جس کا ایک لمحہ ہے

وصل سے پرے لیکن
اِک اُجاڑ سنّاٹا
ایک زرد ویرانہ
بڑھ رہا ہے مُنہ کھولے
یہ کرن نگلنے کو

تیز تیز آنکھوں میں
اشتیاق کا شعلہ
اس طرح بھڑکتا ہے
میری جاں کا پروانہ
بے قرار سا ہو کر
اس طرح لپکتا ہے
پھر یہ کون قوت ہے
کھینچتی ہے جو مجھ کو
تجھ سے دُور رکھتی ہے

پھر یہ کون شیطاں ہے
جو مجھے بچاتا ہے
جسم کے اندھیرے میں
آگ سی جلاتا ہے
موت جبکہ آنی ہے
میری ذات فانی ہے
ہاں مَیں اس کو پہچانی

مُجھ کو کھینچنے والی
زندگی کی مشاطہ !

زندگی کی مشاطہ !
کیوں مجھے سجاتی ہے
جسم کے اندھیرے میں
آگ سی جلاتی ہے

وُہ جو تم سب سا نہیں

وہ تو اِک شاعرِ آوارہ و خود رفتہ ہے!

شبنمی گھاس سے بھیگا ہُوا ملبوس اس کا

کثرتِ شب خیزی سے آنکھوں میں گلابی ڈورے

ہاتھ میں پھول بنفشہ کے لیے

بے نیازانہ چلا جاتا ہے

اس کے بالوں کو پریشان ہَواؤں نے کیا

اس کو کچُھ دھیان نہیں

اس نے دامن سے نہیں گھاس کے تنکے جھٹکے

ایک شب دیر تلک چاند کو دیکھا کیا وہ

لوگ کہتے ہیں کہ شاید تب سے

ہو گیا ہے کوئی سایہ اس پہ

کوئی نہ کوئی تو ہے اس پہ اثر

وہ جو تم سا نہیں

اس کی ہے وجہ کوئی

وہ تو اک شاعر ہے

زبانوں کا بوسہ

زبانوں کے رس میں یہ کیسی مہک ہے!
یہ بوسہ کہ جس سے محبت کی صہبا کی اُڑتی ہے خوشبو
یہ بدمست خوشبو جو گہرا، غنودہ نشہ لا رہی ہے
یہ کیسا نشہ ہے!
مرے ذہن کے ریزے ریزے میں ایک آنکھ سی کھُل گئی ہے
تم اپنی زباں میرے مُنہ میں رکھے جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو
یہ بھیگا ہُوا گرم و تاریک بوسہ
اماوس کی کالی برستی ہوئی رات جیسے اُمڈتی چلی آ رہی ہے
کہیں کوئی ساعت ازل سے رسیدہ
مری روح کے دشت میں اُڑ رہی تھی

وُہ ساعت قریں تر چلی آ رہی ہے

مجھے ایسا لگتا ہے

تاریکیوں کے

لرزتے ہُوئے پُل کو

مَیں پار کرتی چلی جا رہی ہوں

یہ پُل ختم ہونے کو ہے

اور اب

اُس کے آگے

کہیں روشنی ہے

ابد

یہ کیسی لذّت سے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رُک رُک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اُتر رہے ہیں
لہو کے گنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہُوا ہے
یہ چھُوٹتی نبض، رُکتی دھڑکن، یہ ہچکیاں سی

گلاب و کافور کی لپٹ تیز ہو گئی ہے
یہ آبنوسی بدن یہ بازو کشادہ سینہ

مرے لہو میں سمٹتا سیال ایک نکتے پہ آگیا ہے
مری نسیں آنے والے لمحے کے دھیان سے کھنچ کے رہ گئی ہیں

بس اب تو سرکا دو رُخ پہ چادر
دیئے بُجھا دو

رجم

"ابنِ عمر سے روایت ہے کہ جب بدکاری کرنے والے جوڑے کو سنگسار کیا گیا تو مرد عورت پر جھک جھک جاتا اور اُسے پتھروں سے بچاتا۔"

پاگل تن میں کیوں بستی ہے
یہ وحشی، تاریک آرزو
بہت قدیم اُداس آرزو
تاریکی میں چھُپ جانے کی
اِک لمحے کو
اِک لمحے کو
ربِّ قہار! یہ معجزہ کیا ہے!
تیرا خلق کیا ہُوا آدم

لذّتِ سنگ کا کیوں خواہاں ہے

اس کی سحرزدہ چیخوں میں

یہ کس برزخ کا نغمہ ہے

کیا تھی بدن کے زخم کی لذّت

بے تابی سے یوُں رقصاں ہے

ہر بُنِ مُو سے سُرخ و سیاہ لہُو کا دریا اُبل پڑا ہے

اقلیما

اقلیما

جو ہابیل کی قابیل کی ماں جائی ہے

ماں جائی

مگر مختلف

مختلف بیچ میں رانوں کے

اور پستانوں کے اُبھار میں

اور اپنے پیٹ کے اندر

اپنی کوکھ میں

ان سب کی قسمت کیوں ہے

اِک فربہ بھیڑ کے بچّے کی قربانی

وہ اپنے بدن کی قیدی

تپتی ہُوئی دُھوپ میں جلتے

ٹیلے پر کھڑی ہُوئی ہے

پتّھر پر نقش بنی ہے

اس نقش کو غور سے دیکھو

لمبی رانوں سے اُوپر

اُبھرے پستانوں سے اُوپر

پیچیدہ کوکھ سے اُوپر

اقلیما کا سر بھی ہے

اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے

اور کچھ پُوچھے!

مقابلۂ حُسن

کولھوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے
سر میں بھی ہے جستجو کا جوہر
تھا پارۂ دل بھی زیرِ پستاں
لیکن مرا مول ہے جو ان پر
گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو ناپو!

وُہ اِک زنِ ناپاک ہے

وُہ اِک زنِ ناپاک ہے
بہتے لہُو کی قید میں
گردش میں ماہ وسال کی
دہکی ہوس کی آگ میں
اپنی طلب کی چاہ میں
زائیدۂ ابلیس تھی
چل دی اسی کی راہ میں
اس منزلِ موہوم کو
جس کا نشاں پیدا نہیں
سنگم وہ نُور و نار کا

جس کا پتہ مِلتا نہیں

اُبلے لہُو کے جوش سے

پستان اس کے پھٹ چُکے

ہر نوکِ خارِ راہ سے

بندِ لحم سب کٹ چُکے

اس کے بدن کی شرم پر

تقدیس کا سایہ نہیں

لیکن خدائے بحر و بر

ایسا کبھی دیکھا نہیں

فرمان تیرے سب روا

ہاں اِس زنِ ناپاک کے

لب پر نہیں کوئی دُعا

سر میں کوئی سجدہ نہیں

ایک عورت کی ہنسی

پتھریلے کوہسار کے گاتے چشموں میں
گونج رہی ہے ایک عورت کی نرم ہنسی
دولت، طاقت اور شہرت، سب کچھ بھی نہیں
اس کے بدن میں چھپی ہے اس کی آزادی
دنیا کے معبد کے نئے بُت کچھ کرلیں
سُن نہیں سکتے اس کی لذّت کی سِسکی
اس بازار میں گو، ہر مال بکاؤ ہے
کوئی خرید کے لائے ذرا تسکیں اس کی

اِک سرشاری جس سے وہ ہی واقف ہے

چاہے بھی تو اس کو بیچ نہیں سکتی

وادی کی آوارہ ہواؤ! آجاؤ

آؤ اور اس کے چہرے پر بوسے دو

اپنے لمبے لمبے بال اُڑاتی جائے

ہوا کی بیٹی، ساتھ ہوا کے گاتی جائے

الزواٹر لیک ڈسٹرکٹ

چھایا جاتا ہے مری آنکھ کی بے تابی پر
چادرِ آب کی خاموش نگاہی کا فسوں
پر سمیٹے ہُوئے شاخوں میں ہَوا سوتی ہے
چار اطراف کی گہرائیاں ہیں اور میں ہُوں
ساحری شام کی رنگین نظر بندی ہے

دل، مگر جانتا ہے
اک گماں سا ہے کہ اس بھید بھرے پانی میں
مُجھ کو مل جائے گا اس شوق گریزاں کا سُراغ

جس نے توڑا ہے میرے جسم کا تاریک سکوت
واہمہ ہے کہ اسی جھیل کی گہرائی میں
کوئی اثبات کا حرف
کوئی اقرار — کہیں میری صدا سُنتا ہے
دِل مگر جانتا ہے

یہ مِرا دِل کہ فریب آشنا ہے

امر بیل

یہ کیسی امر بیل لپٹی دِل سے
پیتی ہے لہُو پھلواری کا!

کوئی ساون جس کو راس نہیں
مٹّی نے جس کو جنم دیا
پھر چھوڑ دیا

اب ایسی امر بیل لپٹی
پیتی ہے لہُو
جل جانے تک
دھیرے دھیرے مر جانے تک

لیکن یہ مرے سینے کی جلن
جینے کی جلن
یہ یوں تو نہیں کُملائے گی
یہ امر بیل بن جائے گی

خلقت جن کی خوش رنگی دیکھ کے رشک کرے
وہ زہریلے پھل لائے گی
یہ یوں تو نہیں مُرجھائے گی

پچھلے پہر

مَیں جو ناگن کی طرح خاک میں بل کھاتی ہُوں
سر پٹکتی ہُوئی پتھّر پہ جبیں گِھستی ہُوئی
اپنے اُگلے ہُوئے زہراب کو خود پیتی ہُوں
مَیں تو سمجھی تھی یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں
پر کہیں دُور کوئی حشر بپا ہو جیسے
یا رواں قافلۂ آبلہ پا ہو جیسے
مرے پاس آئے ہیں دیکھو مرے جھُوٹے بوسے
خاک اُڑاتے ہُوئے، ماتم کناں کیوں آتے ہیں
بازو پھیلائے ہُوئے، گریہ و زاری کرتے
سینہ کوباں سرِ بالیں مرے نوحے پڑھتے

مرے بوسے مری پُرسش کے لیے آئے ہیں

آکے نزدیک گلے سے مرے لگ جائیں گے

مرے ماتھے پہ اجالے کی طرح بکھریں گے

مری ذلّت کے چمکتے ہُوئے ٹھنڈے تارے

میرے حلقوم میں خُنکی سے ہُوئے آبِ حیات

مری مسموم زباں پر جو بنے انگارے

آستیں میں مری، اشکوں کی طرح جذب ہُوئے

یہ مرے چاکِ گریباں کے مسکتے ٹانکے

آج شب

آج شب میں نیند پر پہرہ دوں گی
چند یادوں، چند اندیشوں کی اِک سنگین کندھے پر اُٹھائے
"جاگتے رہنا" کا آوازہ لگاتی
صُبح دم تک
شہر کی گلیوں میں آوارہ نہ گھوموں گی

کہ

مَیں گھرے نشے میں ہوں
مرا بستر بُلاتا ہے مجھے
نیند، اے محبوب نیند
کب سے تُو مُجھ سے خفا ہے اور مَیں تُجھ سے خفا ہُوں

کونسی منزل پہ چھوٹا ساتھ اپنا
کون جانے
سب گلے شکوے بھلا کر آج آئی ہے
تو آجا
آج مَیں لپٹوں گی تیرے بازوؤں میں
یہ اجازت دے کہ دل کی بات کہہ دُوں
یہ اجازت دے کہ مَیں خود کو کروں تیرے حوالے
اپنا بوجھا توڑتا ہے جان میری
میری بیداری کا پیچیدہ شکنجہ
ذہن پر ہر دم کسا جاتا ہے
آجا

تلاوت

جاں کے کھلے زخم

خوں کی مہک آئی

اس کلبۂ تاریک میں دَر آیا اُجالا

اِک ماند اُجالا

بے نُور اُجالا

دیوار پہ پھر سے وہی صُورت آئی

لے جاؤ کہیں دُور

لے جاؤ یہ بے نور یہ بے آب اُجالا

لے جاؤ یہ ابہام

رہنے دو مرے کلبۂ احزاں میں سیاہی

روشن تھا صحیفہ

روشن تھا ہر اِک ورق

ہر لفظ کی قندیل

آنکھوں سے اُبلے ہُوئے اشکوں نے بُجھائی

نذرِ فراق

بہت گراں ہے ابھی درد، ٹوٹتا ہے بدن
ہوا چلے تو رگ و پے میں ٹیس اٹھتی ہے
کسک سی ہوتی ہے رہ رہ کے سرد پہلو میں
رُکی رُکی سی جو کالی گھٹا برستی ہے
چٹختا جاتا ہے چنگاریوں بھرا بستر
یہ وہ چِتا ہے کہ جو ہو نہ پائے خاکستر

یہ بولتی ہوئی، اسرار کھولتی ہوئی رات

دبی دبی سی ہواؤں میں شاخساروں کی آہ
ڈھلکتی بوندوں کی دیوار و دَر سے سرگوشی

وہ آہٹیں کہ ادھورا نہ ہو کوئی خاکہ
بدن پہ جاگ اٹھیں رونگٹے، وہ امکانات

قریب آؤ تو میرے بدن کی گونج سُنو
مری رگوں میں لہُو کیسے سرسراتا ہے
مرا لہُو تمھیں کِس عجز سے بُلاتا ہے

یہ بے قرار لہُو، یہ مرے بدن کا عذاب
کہ جُرمِ زیست کی اِک مستقل سزا جیسے
یہ جس کے ساتھ ازل تک نباہ کرنا ہے
یہ جس کے ساتھ ہی جینا ہے اور مرنا ہے

مَیں تو مٹّی کی مُورت ہُوں

پھر نیم قدم شب آ پہنچی
مَیں ان بیکار خیالوں کی
رنگیلی کنچن مالا سے
کب تک کھیلوں

مَیں تو مٹّی کی مُورت ہُوں
کیا ہُوا اگر اس مُورت میں
بہتا ہے لہُو کا اِک دریا
اور دریا میں طغیانی ہے

وُہ تیری یاد کا چاند چڑھا
بڑھ بڑھ کر لہریں آتی ہیں
ساحل سے ٹکرا جاتی ہیں

ان اٹھتی گرتی لہروں سے
کیا بچ پائے گا بدن میرا
مَیں تو مٹّی کی مُورت ہُوں
یہ مٹی گھُلتی جائے گی
گھٹتا جائے گا بدن میرا

اِک لمحۂ عرفان

دوستو مجھ کو نہیں دعوئے پیغام بری
ہاں مگر کشف کے لمحات سے گزری مَیں بھی
شب عجب سحر کے عالم میں مری آنکھ کھُلی
کہ زباں پر تھی مرے مَوت کی سی بے مزگی
چادرِ سرد پہ اِک نعش کی مانند تھی مَیں
اتنا بوجھل تھا لہو نبض بہت مدھم تھی
اس گھڑی سر میں نہ تھا دن کے خیالوں کا ہجوم
مری سانسوں میں مری ذات سمٹ آئی تھی

بعد از مرگ کے پیماں مرے دل میں گونجے

اور اس لمحے میں ان سب کی ضرورت نہ رہی

مَیں کہ وہ نقش ہُوں ہر لمحہ مٹاتا ہے جسے

میرا انجام فنا ہے تو چلو یوں ہی سہی!

سرسراہٹ تھی فرشتوں کی نہ سرگوشیِ غیب

چند سُوکھے ہُوئے پتّوں پہ ہَوا ہنستی تھی

مَیں بھی اوہام کے اصنامِ خیالی پہ ہنسی

اور اسی نیند کے سیّال میں پھر ڈُوب گئی

دِل میں اس لمحۂ عرفان کی تائید لیے

دوسرے روز ملاقات کی اُمّید لیے

شہر والو سُنو!

اس بریدہ زباں شہر میں قصّہ گو خوش بیاں آئے ہیں
شہر والو سُنو! اس سرائے میں ہم قصّہ خواں آئے ہیں

شہرِ معصوم کے ساکنو! کچھ فسانے ہمارے سُنو
دُور دیسوں میں ہوتا ہے کیا، ماجرے آج سارے سُنو
وہ سیاہ چشم پستہ دہن سیم تن نازنیں عورتیں
وہ کشیدہ بدن، سبز خط، خوش قطع ماہر و نوجواں
اور وہ جادُوگری ان کی تقدیر کی
وہ طلسمات، سرکار کی نوکری
ایک انوکھا محل
جس سے گزرا تو ہر شاہزادے کا سر خُوک کا بن گیا

درس گاہوں میں وہ جوق در جوق جاتے ہُوئے نوجواں

وہ تبسّم فشاں ان کی پیشانیاں ہائے کھوئیں کہاں

آن کی آن میں پیرا تنے ہُوئے

ضعف سے ان کی مژگاں تلک جھڑ گئیں

جسم کیا رُوح پہ جھرّیاں پڑ گئیں

اور وہ شہزادیاں

کچّی عمروں میں جو سَیر کرنے گئیں

باغ کا وہ سماں

عِشق کے پھُول کِھلتے ہُوئے دُور تک ریشمی گھاس میں

وہ فسوں ساز خوشبو بھٹکتی ہُوئی ان کے انفاس میں

افسروں اور شاہوں کی آغوش میں

اِن کے نچلے بدن کیسے پتھرا گئے

وہ عجب مملکت

جانور جس پہ مُدّت سے تھے حکمراں

گو رعایا کو اس کا پتہ تک نہ تھا

اور تھا بھی تو بے بس تھے، لاچار تھے

ان میں جو اہلِ دانش تھے مدّت ہوئی مر چکے تھے

جو زندہ تھے بیمار تھے

کچھ عجب اہلِ فن بھی تو تھے اس جگہ

سامری سحر سے روگ میں مبتلا

خلعتِ شاہ تھی ان کی واحد دوا

بیشتر قابِ سلطان کے خوشہ چیں

گیت لکھتے رہے گیت گاتے رہے

عہدِ زرّیں کے ڈنکے بجاتے رہے

کن وزیروں سے اُن کی رقابت رہی

اور کام آئی کس کس کے جادوگری

شاہ کا جب کھٹولا اڑایا تو پھر کیا ہوئی وہ پری

جمع کرتے تھے ہم ایک رنگیں فسانہ عجب داستاں

آستینوں میں دفترِ نہاں لائے ہیں

شہر والو سنو!

مہاجر

یہ نیلے پیلے غبارے
خود اپنے زور سے پھُوٹ گئے

نا اندیشی کی بلندی سے
دھجیاں ربڑ کی مردہ کھال کی طرح گریں
کس تیزی سے!

بے جان ربڑ کے یہ ٹکڑے
کس سمت ٹھکانہ پائیں گے

مٹی سے ان کو پیار نہیں
مٹی میں نہیں مل پائیں گے
اور نتھرے نتھرے پانی کا
ہر قطرہ اُن سے کہتا ہے
جو پتھر کاٹ کے نکلا ہے
وہ تازہ پانی کا دھارا
من ماتے رُخ پر بہتا ہے
مٹی اور پانی سے غبارے بہت خفا ہیں

پلاٹ

مَیں اپنے حمل کا بوجھ لیے
دھرتی کو ڈھونڈتی آئی تھی
پر دھرتی کہاں کہاں ہے مَیں جس پر یہ بوجھ اُٹھا لے کر بیٹھ سکوں
وہ جنموں کی سنگی میری
جس کی مٹی میں جذب ہُوا تھا دودھ مرا
وہ جس کی اتھاہ گہرائیوں میں بے کل ہیں نمو کی تحریکیں
جو اپنے پھُوٹتے انکھوؤں سے
بوجھل بھی ہے

جو کوکھ کی طرح امر ہے

اور جذبے کی طرح آزاد بھی ہے

وہ زمیں

کہ جس سے کان لگا کر سُنتی تھی

اُس گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک

جو نظروں سے اوجھل، آتا تھا اسا ویر سوار لیے

جس کے آنے کا وعدہ تھا

لیکن یہ زمیں

مجبور زمیں

جاگیر زمیں

وہ زمیں نہیں

یہ مجھ کو نہیں پہچانے گی

جنموں سے مری بچھڑی سنگی

کِسی سوچ میں ہے

سُن سکھی ذرا

ہم کان لگا کر سُنتے ہیں

شاید کہ کہیں سے آتی ہو
اس گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک
جو نظروں سے اوجھل
آتا ہے ایسا ویر سوار لیے
جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں

بھارت ناٹیم

اُٹھتے ہیں سُبک ایڑیوں کے نرم کنول
نازک ٹخنے سے جھانجھ ٹکراتی ہے
گج گامنی، کامنی کمر، لجاتی چھاتی
مسکاتی ہے، شرما کے ٹھٹک جاتی ہے
دو نین اشارہ کر کے جُھک جاتے ہیں
مسکان سے بھیگے ہونٹ تھرّاتے ہیں
کِھلتے ہیں کنول انگلیوں کی جنبش میں
بانہوں میں دھنک کے قوس ڈھل جاتے ہیں

یہ جسم کہ لہراتی ہے اک نُور کی موج
دھارا ہے ندی کا کہ لچکتی ہے کمر
پیڑو پہ پڑ رہی ہے اِک سلوٹ سی
یا لہریں لے رہا ہے رس کا ساگر

گدرائے ہُوئے آم کے باغوں کی مہک
ساون کے میگھ رس کی بوندوں کی کھنک
گیہوں کی بالیوں کا ادھ کچّا دودھ
اودا ہٹ جامنوں کی، موروں کی پکار
پُروائی کے جھونکوں میں لچکتا ہُوا دھان
بھارت ناٹیم ناچتی ہے ناری
انگڑائی لے کے جاگ اُٹھا ہندوستان

۲۳-مارچ ۱۹۷۳ء

(جب راولپنڈی میں حزبِ اختلاف کے جلسے پر
چار گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی)

کب سے دل سہما ہُوا تھا
کب سے اِک چُپ سی لگی تھی
بات کرنے سے بھی ڈر لگتا تھا
کب سے اِک بارِ سماعت تھی، ہنسی بچّوں کی
دل کو گھیرے ہُوئے رہتے تھے شکوک و اوہام

دفعتاً آج یہ مغرب سے چلی کیسی ہَوا
آج مٹّی سے اٹھا کیسا لہُو ریز غبار
جا بجا سر کو پٹکتا ہُوا دیوانہ وار

شہر کے کُوچہ و بازار میں بل کھاتا ہُوا
راہگیروں سے لپٹتا ہُوا چکراتا ہُوا
بند دروازوں پہ دیتا ہُوا پاگل دستک
کِسی پرچم کی طرح شہر پہ لہراتا ہُوا

آج اندیشوں نے یک لخت مجھے چھوڑ دیا

یک بیک آج، مرے دل سے مٹا خوف و ہراس
آج سینے میں بھڑکتی ہے عجب خون کی پیاس
اِک بگولے کی طرح رقص کو جی چاہتا ہے

غم و اندوہ سے پامال و شکستہ تن ہو
آؤ اے ہم وطنو! رقص کرو، رقص کرو
غیظ کا رقص، بکھرے ہُوئے پندار کا رقص
رنج و رسوائی کا، اُمیدِ نگوں سار کا رقص
پَیرہن چاک کرو مصلحت اندیشی کا
اپنے اشکوں کی برستی ہوئی بوچھاڑ میں آؤ
یہ جھجکتے ہُوئے بازو تو ہَوا میں لہراؤ

جسم کو رقص کے گرداب میں چکرانے دو

شہر در شہر جو ہم رقص میں لہرائیں گے
حلقہ در حلقہ بھنور پڑتے چلے جائیں گے

جسم و جان رقص کریں، نطق و زباں رقص کریں
تلملاتا ہے لہو آج مری رگ رگ میں

سمندر اور آدمی

دُور سے آتا تھا اُٹھتی گرتی لہروں کا شور
ساگر کا مُنہ چُوم رہا تھا رات کا بھیگا نیل
چار طرف اُڑتی تھی گیلی ریت کی سوندھی باس
اس نے کہا "اچھی لگتی ہے ساگر کی آواز"

وہ ساگر کی بوند

ساگر، جس کے نمک سے چمکا اس کا سلونا رنگ،
جس کی بے کل لہرتے ڈھالا اس کا چھریرا انگ،

جس کی ہواؤں میں ہے اس کی سانسوں کا آہنگ

دُور سے آتا تھا اُٹھتی گرتی لہروں کا شور
جس کے پرے پھیلا تھا بیتے قرنوں کا سنّاٹا
ساگر سمٹ رہا تھا

پہلی بار

پہلی بار
پیار کے بعد
اِک دوجے کی بانہوں میں
اپنے دماغ اور بدن کی عریانی کے آئینہ خانے میں
اتنے نہتّے!
اتنے نازک
سانس جھجک کر لیتے ہیں
کانچ کے پُتلے ٹوٹ نہ جائیں

ساحِل کی ایک شام

زائیدۂ بحر ایک بچّہ
ساحل پر سرنگوں کھڑا ہے
وہ تم سے میری ہمکناری
حیران آنکھوں سے دیکھتا ہے

اتنا گمنام، اتنا تنہا
بے خانماں سا، یہ ایک بچہ
جس کا کوئی گھر کہیں نہیں ہے
جس کی وارث زمیں نہیں ہے
جیسے جھُوٹی غذا کا دونا
ساحل پہ کہیں پڑا ہُوا ہے

جیسے گیلی ہَوا کی زد میں
میلے کاغذ کا ایک ٹکڑا

یہ طفل، سمندروں کا جایا
موتی کی طرح زمیں پہ آیا
کنکر کی طرح ہے ٹھوکروں میں

ساحل کی سنگدل ہَوا میں
کیسا زہراب بہہ رہا ہے
یہ اس زہراب کو پیے گا
یہ اس زہراب پر جیے گا
اس کے سوکھے لبوں پر
لہروں کے نمک کا ذائقہ
بس ریت لپٹ سکی ہے اس سے
بس لمس ہَوا کا جانتا ہے
وہ تم سے میری ہمکناری
بُجھتی آنکھوں سے دیکھتا ہے

جاناں، مرا ہاتھ ہاتھ میں لو
ہے اس کے لبوں پہ آنے والی
جینے سے زیادہ تلخ گالی
گالی جو راکھ بن گئی ہے
ہونٹوں پر ہی بکھر گئی ہے

اس راکھ میں کوئی شرر ہے
شاید شعلہ بھڑک ہی اُٹھے
شاید کسی شام ساحلوں پر
لگ جائے مشعلوں کا میلہ
شاید یہ سمندروں کے جائے
مٹّی سے خراجِ زیست مانگیں

سہج چلی پُروائی

سرسوں کے پھولوں سے، گیہوں کی بالی سے سجایا
دھرتی ایک کنواری تم نے دُلہن اُسے بنایا
رس برساتے بادل گزرے، سہج چلی پُروائی
تم کو چھاتی سے لپٹاتے دھرتی کب شرمائی
ہاتھ تمھارے چُھوئیں تو اُس کے انگ کو رُوپ سہائے
اِن ہاتھوں سے کیا گھبراتا، نہیں یہ ہاتھ پرائے
وہ دھرتی جو سدا تمھاری سیوا کرتی جائے
سر پہ ہاتھ دھرو گے تم، بیٹھی ہے آس لگائے

دن ڈوبا ہل پاس کھڑا ہے، دیکھو یہ انیائے
اس کی کوکھ میں بیج تمھارا، دوجا کیوں پھل پائے
یہی ہے ماتا، یہی ہے پتنی، یہی تمھاری بیٹی
پاس وڈیروں کے مت چھوڑو، بڑی اُداس رہے گی

غزلیں

کبھی دھنک سی اُترتی تھی ان نگاہوں میں
وہ شوخ رنگ بھی دھیمے پڑے ہواؤں میں

مَیں تیز گام چلی جا رہی تھی اس کی سمت
کشش عجیب تھی اس دشت کی صداؤں میں

وہ اِک صدا جو فریبِ صدا سے بھی کم ہے
نہ ڈوب جائے کہیں تُندرَو ہواؤں میں!

سکوتِ شام ہے اور مَیں ہُوں گوش برآواز
کہ ایک وعدے کا افسوں سا ہے فضاؤں میں

مری طرح یونہی گم کردہ راہ چھوڑے گی!
تم اپنی بانہہ نہ دینا ہوا کی بانہوں میں

نقوش پاؤں کے لکھتے ہیں "منزلِ نایافت"
مرا سفر تو ہے تحریر میری راہوں میں

یہ پیرہن جو مری رُوح کا اُتر نہ سکا
تو نخ بنخ کہیں پیوست ریشۂ دِل تھا

مجھے مآلِ سفر کا ملال کیوں کر ہو
کہ جب سفر ہی مرا فاصلوں کا دھوکا تھا

مَیں جب فراق کی راتوں میں اس کے ساتھ رہی
وہ پھر وصال کے لمحوں میں کیوں اکیلا تھا

وہ واسطے کی طرح درمیاں بھی کیوں آئے
خُدا کے ساتھ مرا جسم کیوں نہ ہو تنہا

سراب ہُوں مَیں تری پیاس کیا بُجھاؤں گی
اِس اِشتیاق سے تشنہ زباں قریب نہ لا

سراب ہوں کہ بدن کی یہی شہادت ہے
ہر ایک عضو میں بہتا ہے ریت کا دریا

جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے
جو میرے دِل میں ہے اس حرفِ رائیگاں پہ نہ جا

جسے مَیں توڑ چکی ہُوں وُہ روشنی کا طلسم
شعاعِ نُورِ ازل کے سوا کچُھ اَور نہ تھا

پتّھر سے وصال مانگتی ہُوں
مَیں آدمیوں سے کٹ گئی ہُوں

شاید پاؤں سُراغِ اُلفت
مُٹھّی میں خاک بھر رہی ہُوں

ہر لمس ہے جب تپش سے عاری
کِس آنچ سے یُوں پگھل رہی ہُوں

وہ خواہشِ بوسہ بھی نہیں اب
حیرت سے ہونٹ کاٹتی ہُوں

اِک طفلکِ جستجو ہوں شاید
مَیں اپنے بدن سے کھیلتی ہُوں

اب طبع کسی پہ کیوں ہو راغب
انسانوں کو برت چُکی ہُوں

٭

چھوٹی وصل و فراق سے میں
انجان ڈگر پہ چل رہی ہوں

کیوں کھوٹ ہے میری زندگی میں
میں اس کا جواب دے رہی ہوں

کیوں جھوٹے ہیں میرے شب و روز
میں ان کا جواز بن گئی ہوں

ہاں میرے خمیر میں کجی تھی!
اب خوش ہوں کہ اب بھٹک رہی ہوں

اس گریۂ زار پر نہ جاؤ
مَیں دل ہی دل میں ہنس رہی ہُوں

وُہ راز جسے نہ کھول پاؤں
مَیں ایسا راز چاہتی ہُوں

کب ہوگا ختم یہ تماشہ
اتنی کچُھ تو بِتا چکی ہُوں

جو مُجھ میں چُھپا میرا گلا گھونٹ رہا ہے
یا وُہ کوئی ابلیس ہے یا میرا خُدا ہے

جب سر میں نہیں عشق تو چہرے پہ چمک ہے
یہ نخلِ خزاں آئی تو شاداب ہُوا ہے

کیا میرا زیاں ہے جو مقابل ترے آ جاؤں
یہ امر تو معلوم کہ تُو مُجھ سے بڑا ہے

مَیں بندہ و ناچار کہ سیراب نہ ہو پاؤں
اے ظاہر و موجود مرا جسم دُعا ہے

ہاں اُس کے تعاقب سے مرے دل میں ہے انکار
وہ شخص کسی کو نہ مِلے گا نہ مِلا ہے

کیوں نورِ ابد دل میں گزر کر نہیں پاتا
سینے کی سیاہی سے نیا حرف لکھا ہے

مژدہ کہ جانِ سوختہ پانے لگی نئی جِلا
ذوقِ فسردہ، آتشِ رشک سے پھر سُلگ اُٹھا

پھر وہی کیفِ خواب تھا پھر وہی زہر کی مہک
ایک سیاہ ناگ سا دِل پہ تمام شب پھرا

میرے لہُو میں ہیں عجب راز کی سرسراہٹیں
کون ہے میرا رازداں تجھ سے جو ہم کنار تھا

فاصلہ ہے بقدرِ شوق پیشِ نظر ہے رہگُزر
پھر وہ کنارۂ اُفق پاؤں کو کھینچنے لگا

یہ کس کے آنسوؤں نے اس نقش کو مٹایا
جو میرے لوحِ دل پر تُو نے کبھی بنایا

تھا دل جب اس پہ مائل تھا شوق سخت مشکل
ترغیب نے اُسے بھی آسان کر دکھایا

اِک گرد باد میں تو اوجھل ہُوا نظر سے
اس دشتِ بے ثمر سے، جُز خاک کچھ نہ پایا

اے چوبِ خشک صحرا، وہ بادِ شوق کیا تھی
میری طرح برہنہ جس نے تجھے بنایا

پھر ہم ہیں نیم شب ہے، اندیشۂ عبث ہے
وُہ واہمہ کہ جس سے تیرا یقین آیا

دُھوپ

ترتیب

آمنے سامنے

آنسوؤں اور ہنسی کا کوئی تعارف نہیں ہوتا نہ آتی جاتی سوچوں کا کوئی دیباچہ ہو سکتا ہے۔ آدمی کا آدمی سے کیا تعارف! وہ تو ہمزاد ہیں، کیونکہ ہم عصر ہیں۔ پھر بھی دُھوپ کی نظموں اور گیتوں کے سلسلے میں پڑھنے والے سے آمنے سامنے دو باتیں کرنا چاہتی ہُوں تاکہ الجھنوں کا امکان کم تر ہو سکے۔

دیکھنے میں 'دُھوپ' کی نظموں کے کئی رُخ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان متعدّد پہلوؤں کی وحدانیت کو صحیح معنوں میں محسوس کیا جا سکے۔ ادب میں داخلی اور خارجی موضوعات کی حد بندیوں کا رُجحان عام ہے۔ لیکن کیا اندرون ذات خود خارج کا ڈھالا ہُوا پیکر نہیں؟ درحقیقت خارج اور اندرونِ ذات کی حدِّ فاصل مسلسل متحرک ہے۔

ہجر کے اور تنہائی کے آنسوؤں کا دھارا اندرونِ ذات سے نہیں، ذات کے چاروں اُور بکھرے ہُوئے سنگین حالات سے پھُوٹتا ہے۔ آدمی کی خوشی اُس کی ضرورتوں کی تکمیل سے، اس کے مکمّل وجود کی آسودگی سے ہے۔ یہ آسودگی نہ پا کر آدمی تلملاتا ہے۔ ایسا اکثر ہُوا ہے کہ وہ اپنی محرومیوں پر شرم سے آگ بگولا ہو گیا، اپنے دُکھوں پر رویا اور خوشیوں کے بودے پن پر حیران ہُوا۔ انسانی رشتوں کے جھُوٹ پر تلخ ہو گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یا تو اس کے اپنے وجود میں کجی ہے اور یا دُنیا میں سب کچُھ ہے ہی ایک سراب ــــ

پھر اس کے چار اطراف پھیلا ہُوا بے معنی گورکھ دھندا، آدمیوں کے بے دماغ

اور بے رُوح کاروبار، دُکان اور دفتر، اخباروں میں اس کی ذات سے غیر متعلق سُرخیاں، سیاست کی شعبدہ بازیاں، فوج کشی اور سمجھوتے، یہ سب کچھ اس کی رُوح کو چُھو تک نہیں پاتے، کبھی کبھی وہ رحم دلی یا منصف مزاجی کی بنیاد پر کسی واقعہ کی مدحت یا مذمت تو کر سکتا ہے لیکن دل پھر بھی یہی کہتا ہے "ان سب بے سروپا باتوں کا میری رُوح میں اُٹھتے ہُوئے بھونچالوں سے کیا ناتہ!"

اس اٹوٹ پتھریلی تنہائی کے حصار میں ہمارا ادیب، اپنے خیالوں میں غرق، بڑے بڑے اسٹوروں، پولیس تھانوں، اسمبلی کی عمارتوں اور جلی حروف میں "دولت، عظمت، شہرت" دلانے کا وعدہ کرنے والے فوجی بھرتی کے دفاتر کے سامنے گزرتا ہُوا اکثر اپنے محبوب یا خُدا سے طویل گفت گو میں مصروف رہتا ہے۔

سماجی شعور اس جھنجوڑ دینے والی آگہی کا نام ہے جو اس کی ذات کے دُکھ اور سُکھ کا ناتہ بڑے بڑے اسٹوروں سے، پولیس تھانوں سے اسمبلی کی عمارتوں سے اور بھرتی کے دفاتر سے واضح کر دیتی ہے، جیسے تاریک کمرے سے اچانک روشنی میں آجائیں اور... تھوڑی دیر بعد... دُور دُور تک سب کچھ صاف نظر آنے لگے۔

مَیں پڑھنے والے سے اتنی اُمید کرنا چاہوں گی کہ وُہ 'دُھوپ' کے موضوعات کی یکجائی اسی طرح محسوس کر سکیں جیسی کہ مجھے زندگی نے سکھائی۔

دُھوپ کی نظموں اور گیتوں کی زبان کٹھن نہیں، پاکستان میں مروّج قومی زبان سے ذرا مختلف ہے۔ کیوں کہ اس میں عربی فارسی الفاظ کی جگہ، برخ[1] ہندوستانی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

---

[1] برخ بمعنی خالص، سندھی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جو مجھے خالص سے زیادہ بھاتا ہے۔

شاید یوں ہی ہوتا ہے کہ دھرتی سے کٹا ہُوا آدمی جب اپنے وجود کو دوبارہ دھرتی کی بُوباس اور نمک میں پیوست کرنے کے لیے اضطراب کرتا ہے تو ان بولوں کی کھوج کرتا ہے جو اس کی حلال میراث تھے اور جو بے رحمی سے اس کی نوکِ زبان سے چھپٹ لیے گئے ہیں۔

ان بولوں کی ترجیح ابتدا میں میرے لیے کوئی شعوری کوشش نہیں تھی۔ لیکن جوں جوں مَیں اپنے گیتوں کے لیے ربَخ ہندوستانی لفظ ڈھونڈتی گئی توں توں یہ بات کھلتی گئی کہ ہماری بولی کو پچھلے بیس بچیس برسوں میں جس صفائی سے ہندی الفاظ سے پاک کیا گیا ہے اور ایک مذہبی رنگ دیا گیا ہے اس نے اس بولی کو کیسے اپاہج بنا ڈالا ہے۔

بولی کو مذہبی رنگ دیا ہی نہیں جا سکتا نہ زبان کسی مذہب کا شاخسانہ ہو سکتی ہے کوئی بھی زبان، مذہب سے پہلے وجود رکھتی ہے۔ مذہبی کتاب کسی زبان میں تو لکھی جا سکتی ہے لیکن زبان تو مذہب کی پیرو نہیں بن جاتی۔

بولی انسانی تہذیب کا جزو ہے۔ انسانوں کی محنت کے اشتراک کا دلپذیر حاصل؛ یہ محنت انسان فطرت پر کرتا ہے۔ اور فطرت آسمانی نہیں زمینی ہے۔ الوہی نہیں مادّی ہے۔ زمین، ندّی نالے، کھیت کھلیان، وادیاں اور پہاڑ جغرافیائی حقیقتیں ہیں۔ ان حدوں میں رہنے بسنے والے لوگوں کی ہزاروں برسوں کی مشترکہ تاریخ انھیں قوم کی شکل دیتی ہے۔ معاشرے کی بڑھوت کے ساتھ ساتھ بولی بڑھتی ہے، پہلو دار بنتی ہے فطرت کو آدمی نے کبھی اپنے وجود کا حصہ سمجھا کبھی اس سے پیار کیا اور کبھی اس کی زور آوری سے خوف کھایا۔ کبھی معاشرے کے تضادات کو نہ سمجھتے ہوئے فطرت کی اَن دیکھی، طاقت ور سرکش قوتوں سے منسوب کیا اور کہیں ان کی تجسیم کے سامنے تو کہیں انھیں غائب گمر

برحق مان کر سربسجود ہوگیا۔

انسانی تہذیب کی تاریخ میں مذہبی نوعیت کے کئی سجدے ہیں۔ لیکن کیا ان سجدوں نے بذاتِ خود کسی مادّی حقیقت کو یکسر بدل ڈالا؟ ٹھوس سماجی علوم ہمیں یہ آگہی دیتے ہیں کہ ان سجدوں سے پہلے اور بعد میں تاریخی معاشرتی عمل سے پیدا ہونے والے یا اس عمل کی وضاحت کرنے والے خیالات اور تصوّرات کا ایک پیچیدہ اور گنجلک جال بچھا ہے۔ جہاں ان خیالات نے مربوط ہو کر نظریئے کی شکل اختیار کر لی وہاں آدمی نے اس نظریئے کو اپنی بولی میں پیش کر دیا۔

لیکن اس طرح بولی تو نظریاتی نہیں ہو گئی۔ بولی کا رشتہ تو دھرتی سے بنتا ہے، دھرتی ہی بولی کی پہچان ہے۔ بنگال کی بولی بنگالی، سندھ کی بولی سندھی اور پنجاب کی بولی پنجابی ہے!

میری زبان کا تعلق بھی ایک دھرتی سے ہے۔ وہ دھرتی جہاں میرے پُرکھوں کی ہڈیاں مٹّی میں ملی ہیں۔ وہاں کے گاؤں گاؤں میں یہی زبان آج بھی بولی جاتی ہے۔ اس زبان کی بنیادی حرکت، گرامر، محاورہ اور اس کی ترکیبوں میں رچا ہُوا رویّہ سب کچھ اسی دھرتی سے پھُوٹا تھا۔ کسی الوہی حُکم سے نازل نہیں ہُوا تھا۔ تُلسی اور کبیر اس زبان کے لوک شاعر ہیں۔ یہ بولی یو پی، سی پی اور بہار کے کسانوں کی بولی ہے۔ شہروں میں بسنے والی آبادی پر درباری زبان فارسی کا اثر ناگزیر تھا۔ بلکہ سیاسی اصطلاح کے مطابق یوں کہیے کہ شہری بالائی اور متوسط طبقے کی طبقاتی خُو ہی یہ تھی کہ وہ اپنے کھیتوں سے پھُوٹنے والے اور کسانوں کے پسینے میں نہائے ہوئے بولوں پر درباری زبان کی ترکیبوں کو ترجیح دیں۔۔۔ یہاں یہ واضح ہو جائے کہ یہ اثرات محض ہماری بولی سے مخصوص نہیں

ہر طبقاتی سماج میں بولی میں اسی نوعیت کی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں - ہماری بولی کے ساتھ المیہ یہ ہُوا ہے کہ ہجرت کے باعث ہماری طرح یہ زبان بھی کلچر کے اصل خالق طبقے، یعنی اپنے کسان طبقے سے کٹ گئی ہے - اس طرح دھیرے دھیرے ہماری بولی سیاسی مصلحتوں کے DE-HUMANIZING عمل کا اس بُری طرح شکار ہُوئی ہے کہ مصنوعی قدغنوں نے اس کا خون سُکھا ڈالا ہے - یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے سے دوسری بولیوں کے ادیب دبی زبان سے کہنے لگے ہیں کہ اس بولی میں آدمی کے اصلی کچّے اور گرم جذبات کا اظہار کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے لیکن جس زبان پر وُہ ایسا تبصرہ کرتے ہیں وُہ ہماری پوری ساری زبان نہیں بلکہ درحقیقت ہماری بولی کی ایک طبقاتی شکل ہے -

مہاجر شاعر کو اپنی بولی میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے سوجتن کرنے ہوں گے — شاعری اگر اپنے خالق سے گرم خون طلب کرتی ہے تو شاعر بھی بولی سے گرم خون مانگتا ہے۔ سندھ میں ہماری بولی ایک تہذیبی اقلیت کی بولی کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بھی ایسی اقلیت جو اپنی دھرتی سے اُکھڑی ہُوئی ہے - اب ہمارے سامنے جان جوکھوں کا کام ہے - ایک طرف مصنوعی قدغنوں کو ٹھکرا کر ہمیں اپنے لوک شاعروں کی بازیافت کرنی ہے اور دوسری طرف ہمیں اس نئی سرزمین کے عوام کی زبان سندھی سے زندگی کا جیتا جاگتا رس حاصل کرنا ہے - گویا ہمیں اپنے ماضی سے اپنے مستقبل کا سچّا، مثبت اور دیانتدارانہ رشتہ خود جوڑنا ہے صرف تب ہی ہم زبان کے ساتھ انصاف کر سکیں گے -

---

فہمیدہ ریاض

آشا ڈور اٹوٹ

جلاتی دیپک رَین نراس
لُٹے جب نگر بھروسوں کا
کامنائیں ہو جائیں اُداس
کِسی کی ایک دھڑکتی جان
کوئی رُربل سا اِک انسان
جو ٹکرا دے نَینوں سے نَین
ہمیں پھر آجاتا وشواس

آشا ڈور اٹوٹ

رات تلملاتی ہے

رات تلملاتی ہے

بے لسی کے پنجے میں
ہانپتی، غصیلی رات
پنکھ پھڑپھڑاتی ہے

میری کوکھ میں ہر آن
پَل رہا ہے سنّاٹا
اور، میری تنہائی
چُوستی ہے سینے سے
گرم دُودھ کا دھارا

عُمر بھر کی کڑواہٹ
پُوچھنے لگی اِک بار
'زہر یہ بھی پینا ہے!
ساری رات جینا ہے!'

پر یہ کیسا دھیان آیا
شانت ہو گئی کایا
بھُولے بِسرے سنگی کا
کوئی بول نرمی کا

'پیار ہی تو جیون ہے'

کیا خیال آیا ہے
کیسی یاد لایا ہے
درد ڈھل گیا جیسے
دِل سنبھل گیا جیسے
جیسے میرے ماتھے پر
مہربان ہونٹوں سے

کوئی پیار کرتا ہے

جیسے نرم ہاتھوں نے
خشک کر دیے آنسو

پتّیوں کی جھالر سے
ٹُوٹنے لگے جُگنُو

سو رہا ہے سب سنسار
جاگتی ہے بس مٹّی

اس سمے تو اکھوؤں کے
بیج پھُوٹتے ہوں گے

اب جو آئی پُروائی
رات کی مہک لائی

پاس ہی کہیں شاید
جھاڑ ہے چنبیلی کا

ایسی نیند آئی ہے
یُوں گمان ہوتا ہے

جس طرح مرا پریمی
میرے پاس سوتا ہے

جاناں

جاناں ! دِل عشق سے سُلگتا ہے
دیکھو یہ روشنی کا فوّارہ
کیا موت کے بعد بس اندھیرا ہے
میرے دِل کو یقیں نہیں آتا

لہراتا ہے عجیب اِک شعلہ

ہنستے بچّوں کی ناچتی آنکھوں میں
دوشیزاؤں کے گرم رخساروں میں
سرکش لڑکوں کے گونجتے نعروں میں
لہراتا ہے عجیب اِک شعلہ !

جاناں تیری تنگ تر ہم آغوشی میں
اور میرے گرم بوسۂ لب میں

چاہت میں بدن کے تُند ٹکراؤ سے
جو شعلۂ عشق کا بھڑکتا ہے
ساحل پہ سیپیوں کے متوالے
لڑکوں کے رُخوں پہ جو دمکتا ہے
جو ہاتھ سنْوارتے ہیں اس دُنیا کو
اس ہاتھ کی نبض میں دھڑکتا ہے
وہ شعلہ کس قدر فروزاں ہے!

تاریکیٔ مرگ، جیسے سُوکھا جنگل
اس شعلے کی لپٹ سے لو دینے لگا
ہر نخلِ خشک، روشنی کا مینار
میرے چاروں طرف چراغاں ہے
مَیں بھیگ گئی ہُوں اس اُجالے میں
سَر پر سُورج ہے سامنے تم ہو
سایہ بھی تو درمیاں نہیں باقی
تاریکی کا نشاں نہیں باقی

گیت

چھل مِل اوڑھنیوں کی ، جگ مگ گہنوں کی متوالی
چنچلتا کی مُورت ، میٹھے بان چلانے والی
آیا کہاں سے اتنا مان
آیا کہاں سے اتنا مان

بِندیا ، لالی ، کاجل ، مہندی ، بول تو کہاں گنوایا
دھول کروں مَیں سنگھار ، تری گڑیوں نے رس رچایا
تُو نے مری جلائی جان
آیا کہاں سے اتنا مان

کیوں ری ہٹیلی سُنے نہ میری، مَیں بھی نہ تجُھ سے بولوں
نا تجُھے دُودھ کٹوری مَیں دُوں، نا مَیں، کوڑیا کھولوں
اب تو مَیں نے بھی لی ٹھان
آیا کہاں سے اِتنا مان
لو وہ لسوری، ٹپکے آنسُو، سمجھوں چالیں تیری
اری مَیں کب کی ہاری تجُھ سے، رُوٹھ نہ مجُھ سے میری
سوتن ، بیرن ، جان
میری سوتن، بیرن جان!

ایک لڑکی سے

سنگدل رواجوں کی
یہ عمارتِ کہنہ
اپنے آپ پر نادم
اپنے بوجھ سے لرزاں
جس کا ذرّہ ذرّہ ہے
خود شکستگی ساماں
سب خمیدہ دیواریں
سب جھکی ہُوئی کڑیاں

سنگدل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں!

اِک صدائے مستانہ!

ایک رقصِ رِندانہ!

یہ عمارتِ کہُنہ ٹُوٹ بھی تو سکتی ہے

یہ اسیر شہزادی چھُوٹ بھی تو سکتی ہے

یہ اسیر شہزادی ——!

جبر و خوف کی دُختر

واہموں کی پروردہ

مصلحت سے ہم بستر

ضعف و یاس کی مادر

جب نجات پائے گی

سانس لے گی دزّانہ

محوِ رقصِ رِندانہ

اپنی ذات پائے گی

تُو ہے وُہ زنِ زندہ

جس کا شعلہ ہے

جس کی رُوح آہن ہے

جس کا نُطق گویا ہے

بازوؤں میں قوّت ہے

اُنگلیوں میں صنّاعی

ولولوں میں بیباکی

لذّتوں کی شیدائی

عشق آشنا عورت

وصل آشنا عورت

مادرِ خُداوندی

آدمی کی محبُوبہ

گرہستن

سنگیت کے دائرے بناتی ہوئی چال
آنگن سے رسوئی کی طرف جاتی ہُوئی
اِک ہاتھ دھرے کمر کی گولائی میں
چُٹکی میں سارا کام نبٹاتی ہُوئی

ہنستا بالک ہری بھری گودی میں
سُکھ چَین سُہاگ کا سبھاؤ میں رچا
ہونٹوں پہ چھلکتے ہیں رسیلے بوسے
سب تن سے چھلکتی ہُوئی جیون مُدرا

گھر کے بیوہار میں سویرے سے لگی
چہرے پہ تھکاوٹ کا کہیں نام نہیں
گدرائے بدن میں ہے جوانی کا تناؤ
پربت بھی کاٹ دے تو کچھ کام نہیں

دُوجے کو تاکتی ہے چنچلتا سے
لمبی چوٹی کمر پہ بل کھاتی ہے
ہنستی جاتی ہے چُلبلاہٹ سے بھری
ساجن کو جھلک دِکھا کے اُکساتی ہے

دیکھو تو سہاگنی کے مُکھڑے کی دمک
اپنے پریتم کی آنکھ کا تارا ہے
جیون کھیتی کو سینچتی جائے گی
امرت کی ندی کا رَس بھرا دھارا ہے

ایک کتاب

یہ کیسا جگ مگ سونا ہے

ان حرفوں میں ،

ان لفظوں میں ،

یہ ، کچّا سونا ، جس کی ڈلک سے میرے نَین دمک اُٹھے

میرے تاریک لہُو میں کیسا نڈر اُجالا دَر آیا

اور سارے تن میں پھیل گیا

یہ کیسی سچی سانسوں کی گرمی سے کتاب پگھلتی ہے !

یہ کس دِل کی دھڑکن ، دُھک دُھک

میرے دِل سے ٹکراتی ہے !

مَیں کان لگا کر سُنتی ہُوں دروازے پر کیسی دستک !

اس گھر میں تو اندھیارا تھا
پھر کون جھروکہ کھلتا ہے
یہ کہاں سے آئی چندر کرن
جس سے روشن سارا آنگن

میرا دِل ایسے چونکا ہے
حیرت سے آنکھیں بھر آئیں
یہ آنسو پیار کا آنسو ہے
یہ آنسو، اُجلا آنسو ہے
اس آنسو میں تو ہنستا ہے
وُہ کچّا سونا، جس کے ڈلک سے میرے نَین دمک اُٹھے

دُھوپ

رَین تو ٹھنڈی تھی
پر ، جب دوار کھڑی ہے بھور
بڑھا ہے جاڑا
پڑتا توڑ کا

چُپ گاڑھا اندھیارا کہاں پتہ دیتا ہے
اس پالے میں
اس جاڑے میں
توڑ کا سارا زور لگاتی سِسک رہی ہے رَین
کوئی پَل دو پَل میں
پَو لگے گی پھٹنے

نکل آئے گی گرم دُھوپ
رے ٹھنڈے اندھیارے!
تُو، اور مری یہ سوچیں اس پل کی .....

کتنا سنّاٹا ہے!
بس اِک ننھّے پل میں
جیون مجھ کو اپنا پیلا، سُتا ہُوا، تھپڑایا مُنّہ دِکھلاتا ہے
پھر چھُپ جاتا ہے
اور مَیں رو دیتی ہُوں
گھر میں، گھر سے باہر پَل پَل ہائے یہ کِن کا ساتھ!
گھُٹ گھُٹ کے رہ جائیں، کہہ نہیں پائیں دِل کی بات،
یہی تو دوزخ ہے!
تنہائی کی دوزخ ——

کل کے اخباروں کا باسی جھُوٹ فضا میں تیر رہا ہے
جن سے پھُوٹ رہا ہے نئے اخبار کے جھُوٹ کا مبہم دھڑکا
ان میں گندھا ہُوا دن میرا دوار کھڑا ہے

بے مطلب محنت کا
تنہائی کا
گہری پیاس کا.....

پر مَیں اِتنا جان چُکی ہُوں
من میں مان چُکی ہُوں
بھیڑ بھیڑ میں بکھرے مُجھ جیسے بہتیرے

اِک دن ایسا بھی آئے گا
جب انہونی ہو جائے گی
ہم سب کی پہچان پھریرا بن کر اِک دن لہرائے گی
اس زہریلی، دھوئیں سے بھری ہَوا میں اِک دِن.....

چُپ گاڑھا اندھیارا کہاں پتہ دیتا ہے
سِسک رہی ہے رَین
کوئی پَل دو پَل میں پَو لگے گی پھٹنے
نکل آئے گی گرم دُھوپ

پتّھر کی زبان-۲

پتّھروں پر دمکتا اکیلا لہُو

جھلملاتا لہُو، بہہ رہا ہے

میرے بیٹے، یہاں دیدہ ور کون ہے

جو نظّارہ کرے

دامنِ کوہ میں

کیسے چمکے ہیں یاقوت و مرجاں

ہم وطن تو کوئی سُننے والا نہیں

پتّھروں نے سُنیں

کرب کی سِسکیاں

آخری ہچکیاں

جسم پر پیرہن پارہ پارہ

گولیوں سے بدن پارہ پارہ

بے سہارا لہُو بہہ رہا ہے
خُون بیدار ہے جلد سوتا نہیں
سینۂ سنگ میں جذب ہوتا نہیں
تازہ تازہ لہُو بہہ رہا ہے

یہ لہُو ختم ہو گا تو تھم جائے گا
آخرش سنگ ریزوں پہ جم جائے گا

ڈوبتا ہے پہاڑوں میں سُورج
سَنسنانے لگا ہے کہستاں
اَور کُچھ دیر میں رات آ جائے گی
رات چھا جائے گی
دُوسری صُبح سے صُبحِ محشر ــــــ

صُبحِ محشر، کہ جب
قہرمانی کا اِک پَیکرِ آتشیں بن کے سُورج زمیں سے نکل آئے گا
جو بھی ہے اس زمیں پر وُہ جل جائے گا
جو لہُو تھم گیا

سنگ پر جم گیا
اس لہُو کی سیاہی رہے گی

یہ سیاہی رہے گی ابد تک
بے حسوں کی جبینوں کی کالک
اِس سیاہی کو پھر کون دھو پائے گا!
کوئی پیغامِ تجدیدِ اُلفت؟
کوئی سیلابِ اشکِ ندامت؟

حوصلہ کِس میں تھا
کِس میں ہے حوصلہ
وقت لکھتا ہے تاریخ کا فیصلہ
دامنِ کوہ میں
ہم نہ جانیں، اگر
ہم نہ مانیں، مگر
یہ ہمارا لہُو بہہ رہا ہے

۲۳۔مارچ ۱۹۷۴ء

چار سُو ہے بڑی دہشت کا سماں

کِسی آسیب کا سایہ ہے یہاں

کوئی آواز سی ہے فاتحہ خواں

شہر کا شہر بنا گورستاں

ایک مخلوق جو بستی ہے یہاں

جس پہ اِنساں کا گزرتا ہے گُماں

خود تو ساکت ہے مثالِ تصویر

جنبشِ غیر سے ہے رقص کناں

کوئی چہرہ نہیں جُز زیرِ نقاب

نہ کوئی جسم ہے، جُز بے دِل و جاں

عُلماءِ دُشمنِ فہم و تحقیق
کودنی شیوۂ دانش منداں

سبز خط عاقبت و دیں کے اسیر
پارسا خوش تن و نوخیز جواں

شاعرِ قوم پہ بن آئی ہے
کِذب، کیسے ہو تصوّف میں نہاں

لب ہیں مصروفِ قصیدہ گوئی
اور آنکھوں میں ہے ذِلّت عُریاں

یہ زنِ نغمہ گرو عشق شعار
یاس و حسرت سے ہُوئی ہے حیراں

کِس سے اب آرزوئے وصل کرے
اِس خرابے میں کوئی مرد کہاں

پتلا ، نوکدار چاند

پتلا ، نوکدار چاند بدلی سے نکلا
تم کیوں ڈرتے ہو !
ہم سے وحشت کرتے ہو ——— !

ابھی تو تم نے میرے لہُو کا گونجدار ، بے انت گیت نہیں سُنا
ابھی تو مَیں نے تمھارے تن میں چکراتا ، بے انت بھنور کا رقص نہیں
محسوس کیا

ابھی بدن کی گگر تلک ہے پیار
نہیں چھلکا پیتم
آؤ ، آؤ
ممکن ہے کیا کیا

ایسا ہو سکتا تھا!

ابھی تو برفیلی، گیلی سفّاک ہوا کے کوڑے نہیں پڑے تن پر

ابھی نہیں ٹُوٹ کر برسی کوندے لپکاتی اُمڈی گھنگھور گھٹا

نہیں لگے جھالے اٹوٹ

ابھی نہیں گزرے چودہ دن، چودہ راتیں

میرے پیار کا پورن ماشی چاند جھلملاتا کب نکلا

ابھی تو بس یہ ہے ——

بدلی کی اوٹ میں چلا

پتلا، نوکدار چاند ——

اکیلا کمرہ

ہاں ، ابھی اکیلا پن ہے
تنہائی کی اُلجھن ہے

جب چُپ چُپ کریں تماشا
اور چُپ چُپ سُنیں کہانی
پھر فوج کے بُوٹ تلے ہے
پُورب کی گھائل دھرتی
اور دیس کے سب چوروں کو
اِن پیٹے ہُوئے نُہروں کو
پھر جشن مناتے دیکھیں
شہنائی بجاتے دیکھیں

کچھ جی سا متلاتا ہے
اور یہی خیال آتا ہے
کمرے میں بڑی گھٹن ہے
اِک دبی دبی اُلجھن ہے

پر اس کمرے سے باہر
گھن گھن بادل گرجا ہے
کیا ٹوٹ کے مینہ برسا ہے
دُھندلائی ہُوئی ہیں سڑکیں
جیسے کچھ سوچ رہی ہیں
جُگ بیتے سمے نے ڈھالی
چاندی کی نئی کٹھالی
جنموں کے کرم پچھلے ہیں
سب دِین دھرم پگھلے ہیں
اب دھرم کا رُوپ نیا ہے
سارا بہروپ نیا ہے
مسجد مسجد یہ نمازی

سجدوں میں پڑے یہ غازی
گردن تو اُٹھا کر دیکھیں
نظریں تو بچا کر دیکھیں
جس سمت جُھکے ہیں ماتھے
اس سمت کہاں ہے کعبہ
اس اور نہیں کوئی قبلہ
منبر پہ نہیں ہے مُلّا
یہ تو ایک ٹینک کھڑا ہے

اور ٹینک کے پیچھے دَھن ہے
اس دیس میں بڑی گُھٹن ہے

اِک پَل بُھٹکا میرے دوار

اِک پل بُھٹکا میرے دوار

بس ایسا ہے جیون ——

جیسے گھر بھر میں پھیلی چُپ

جیسے دُھول جمی شیشوں پر

جیسے راکھ کے اُڑتے ذرّے

جیسے گیت کے بکھرے پنّے

جیسے گلے میں چُبھتے آنسو

جیسے اپنے دِل کی دھڑکن

جیسے پوس کی دُھوپ اکیلی

جیسے سُونا سُونا آنگن

جیسے تن میں چھپا سناٹا
جیسے پیاسا ماس برہن کا
جیسے جاتے دن کی اُداسی
جیسے آتی رَین کا دھڑکا
جیسے نیر سے نَین نہائے
جیسے اِندر دھنش دُھندلائے
جیسے آس کمل ٹھکرائے
ایسے کھڑی ہوں سیس جُھکائے
چھاتی سے بانہیں لپٹائے
دِل میں بھینچے دِل کا پیار
اک پَل ٹھِٹکا میرے دوار

بس ایسا ہے جیون !

کارل مارکس

نہ وہ کوئی اوتار پیمبر، نا جگ کا رکھوالا
اپنے جیسا اِک انساں تھا گھبری داڑھی والا
وُہ بھی زندہ تھا دھرتی پر ہُوئی یہ بات پُرانی
مر کھپ گیا، برس بیتے ہیں وُہ بُڈّھا نصرانی
ہونی کا چکّر باقی ہے، انمٹ جنم کے ٹکڑے
اسی گھیر میں ناچ رہے ہیں بدل بدل کر مُکھڑے
اپنے اپنے کام ہیں سب کو، اپنا اپنا جیون
اپنی اپنی سمجھ سے جگ میں سوچ رہے ہیں نردھن
دکھیتی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، کیا ہے ہونے والا
پُورب سے لے کر پچھم تک دھڑک رہی ہے جوالا

پگڈنڈی کے کسی موڑ پر وُہ بھی کھڑا ہُوا ہے
سمے نے کتنی دھول اُڑائی شاید دیکھ رہا ہے

دیکھا تھا سو بار یہ فوٹو، اس پَل ٹھٹک گئی ہُوں
ہونٹ کاٹ کر کانپ اُٹھی ہُوں، پَل بھر جب سوچا ہے
تُو کیسا انساں جنما تھا ——
کیا کچھ چھوڑ گیا ہے!

کالی دھرتی پھاڑ کے سُورج جہاں جہاں نکلا ہے
آدمیوں نے تڑپ تڑپ کر تیرا نام لیا ہے
یُوں تو سمے رُکے نہیں روکے، پر ایسا بھی ہُوا ہے
اُڑتی صدی نے پل بھر تھم کر مُڑ کے تجھے دیکھا ہے
اِک اِنسانی نسل نے تجھ کو رہ رہ کر سوچا ہے
ایک نسل نے ہاتھ اُٹھا کر تجھے سلام کیا ہے

دیوار

جب جب دیوار گرے گی

بارود کی بُو پھیلے گی

دیوار کہ جس پہ لکھی ہے

اپنے جیون کی کہانی

روندے ہُوئے اپنے بچپن

اپنی ویران جوانی

پَل پَل نیلام ہمارے

گرتے ہُوئے دام ہمارے

کجلائے بدن کی جوتی

رُلتے ہُوئے مَن کے موتی

جیون کی کمائی ذِلّت
آنسوؤں میں بھیگی روٹی
سب زخم جو دِل پہ کھائے
جو دُکھ رو رو کے اُٹھائے
پَل پَل کا حساب لگا ہے
دیوار پہ سب لِکھا ہے

جب جوان لہُو میں نہائے
جیلوں کے اندھیرے سائے
بارود کی بُو پھیلے گی
کوئی دیوار گرے گی

بارود میں سُلگ رہی ہے
کِس کی مغرور جوانی
ہنستا ہُوا بھولا بچپن
لکھّے گا نئی کہانی

بہاؤ

جھر جھر برکھا برس رہی ہے، سنن سنن بہتی ہے ہَوا
آڑی ترچھی پڑیں پھوا ریں بھگو گئیں آنچل سارا
بھیگی ماٹی سے سوندھی مہکار کا جھرنا اُبل رہا
مَدُھر مِلن جَل اَور ماٹی کا چار اور رستنا رہا ہے
ٹھنڈی ہَوا کے چھُو جانے سے
جاگ رہا ہے شریر
زندگی کا میٹھا رس مانگ رہا ہے ———

سُونی سیج، اندھیرا آنگن، آس کا دیپک بجھا ہُوا
بیٹھی ہُوئی نچوڑوں پلّو، تکوں برستی ہُوئی گھٹا
چھُو کر دُور چلی پُرؔوَیّا، اگن سے جیسے دُھواں اُٹھا
تن میں تڑپی پریم کامنا، بادل میں کوندا لپکا

پیاس بُجھا پائے گی کہاں یہ آنسوُ کی بے بس برکھا
بھیگے نینوں میں پھر اُترا اِک بھُولا بِسرا سپنا.....

کوئی تو آئے رَین اندھیاری
مہک سے بوجھل، کاری کاری
مِرے سنگ ہو مِیت مِرا
پھِر برسے گھنگھور گھٹا!

گرج گرج جی بھر کر برسے
بجلی چمک چمک کر برسے
مَیں سِمٹوں اِس کی چھاتی میں
جیسے بجلی گھٹا میں سمٹے
جس کی کایا میں مِٹ جانا جنم کا سب سے میٹھا سُکھ ہے
سُکھ میں کام کا سارا رس ہے
رس کی بوند بوند میں امرت
تالُو سے پاتال تلک سب کچُھ جل تھل کر دیتا ہے
سب شیتل کر دیتا ہے

جنم سپھل کر دیتا ہے

بیٹھی ہُوئی نچوڑوں پلّو، تکوں برستی ہُوئی گھٹا

آنسو پُونچھ کے سوچ رہی ہُوں

یُہی تو سچ ہے جیون کا!

لوک لاج، رُسوائی کا کھٹکا، ڈر سوکھے مُنہ والوں کا

مرے شریر کی پریم کامنا ــــــ

جنم کنول کیچڑ میں کھلا.....!

مرے جاگتے بدن، نہیں، مَیں تجھے نہیں ٹھُکراتی ہُوں

تُجھے نہیں دیتی ہُوں دھوکا، آنکھیں نہیں چُراتی ہُوں

تُو ہی مری آتما کا سچ، تُجھ کو گلے لگاتی ہُوں

تری کامنائیں پوتر ہیں، مَیں سوگند اُٹھاتی ہُوں

منڈی میں ترا سُکھ نہیں ملتا، کب یہ بات بھُلاتی ہُوں

جیون لمبی برہ رَین ہے اَور مَیں سوچتی جاتی ہُوں

مہاجر

کرودھ کپٹ سے بھرے بول

بول ہمارے بڑوں کے

اُونچے اُونچے کڑے بول

دھرتی کی ننگی چھاتی پر

ناچ رہے ہیں بڑے بول

رستے گھاؤ ہرے رہیں گے جی کی کاٹی جڑوں کے

ہم کو گونگا کر گئے دیکھو بول ہمارے بڑوں کے

بول ہمارے بڑوں کے ماس کے کُل بُل کیڑے

ترے ماس کو کھاتے جائیں، پلتے جائیں

دُور سندھ کے جنگل بولیں سائیں سائیں
گرم ، اندھیرے جنگل بولیں سائیں سائیں
سِندھڑی کے سَنْولائے بدن سے کب سے پھُوٹ رہا ہے پسینہ
اس گاڑھی ، کھاری بُو کی پہچان اگر تُجھ کو مل جائے
کیوں پھر کھوٹی بات ترے ہونٹوں پر آئے
کیوں پھر لال رُتوں میں تُو پیلا پڑ جائے
کیوں پھر مُکٹ پہ سج کر پھُول ترا کُمھلائے
کیوں پھر تری اُٹھان تری کایا سے لجائے
کیوں پھر تیرا اِنسانی مُکھڑا مُرجھائے

لوری

اری تیرا چاند مُکھڑا
مری جان کا یہ ٹُکڑا
دیکھتی ہی جاؤں ری
نَین میں بساؤں ری

تُجھ کو اپنی بانْہوں کا جُھولنا جُھلاؤں ری
کلیجے لگاؤں ری

سُن ری میری نَین تارا
تری ماں کا جیون سارا
آنسُوؤں کی بہتی دَھارا
گُزرتا چلا گیا

اسی نتھرے جل کا ہے یہ کٹورا بھرا ہُوا

پھُول ہاتھ، کنوّل پاؤں اسی سے دُھلاؤں ری

نَین سے لگاؤں ری

دُکھی جیون روتے روتے، تجھُے دیکھ آنسُو روکے

کھِل کھِلا کر ہنّس پڑے

مری سہمی مامتا کو تجُھ پہ مان ہیں بڑے

لگے کل کی بات مُجھ کو

یاد ہے وہ رات مُجھ کو

تُو نے جب جنم لیا

رات تھی وہ بڑی کالی

پیڑا تڑپانے والی

پر تری ہنکار سُن کر دِیا سا تھا جل گیا

پیارے پیارے انگ تیرے

تازہ تازہ، ہرے بھرے

چُومنے نہ پاؤں ری
کانپ کانپ جاؤں ری

جانتی ہُوں مرے دوار کھڑا ایک بھیڑیا
کھا رہا میری جوانی، مرا خون پی رہا
بھیڑیا جو دھن تے پالا
جگ پہ راج کرنے والا
ہم کو جُگ جُگ کا شراپ

جس کی کارن اس نگر میں
سوچنا اِک دوش ٹھہرا
پیار کرنا —— مہاپاپ

آدمی کی آتما کا خُون اس کے مُنہ لگا ہے
تری باٹ تک رہا ہے
رَین سو نہ پاؤں ری
جاگتی ہی جاؤں ری

سُن ری میری کوکھ جائی
یہ نگر انیائے کا ہے
گُن تجھے سِکھاؤں کیا

آتی جاتی ناریوں نے
بُوٹے کاڑھے جالی جالی
پروسی تھی تھالی تھالی
کھا گیا جو بھیڑیا

آج ہر رسوئی خالی
تجھے مَیں دِکھاؤں کیا
گُن تجھے سِکھاؤں کیا ——!

تُجھے جب مَیں گود میں لُوں
سمے کی پُکار سُنوں
بڑی ہاہاکار سُنوں
رن کی للکار سُنوں

یہی بار بار سُنوں
ترا گُن ہے 'ویرتا' !

سُن مری ننّھی سی جان
یہ زمین یہ آسمان
سُکھ کی ساری آن بان
منڈیوں میں بھرا دھان

جب تلک ہمارا نہیں
چَین سے گزارا نہیں
کِسی کا سہارا نہیں
کوئی اَور چارہ نہیں

بھیڑیئے سے نہیں ڈرنا
مری جان! جم کے لڑنا
کبھی مست ہونا نراس

ویرتا سِکھاؤں تجُھ کو

شیرنی بناؤں تجھ کو
ڈر نہ پھٹکے آس پاس

سُن مری ننھّی نویلی
نہیں ہوگی تُو اکیلی
سنگ ہوں گے بانْہہ بیلی

تیرے سنگی، تیرے میت
تیرے ساتھ ساتھ ہوں گے
ہاتھ میں کئی ہاتھ ہوں گے
یہی میری ایک آس !

❋

نَین ترے انجان

کِتنے نَین ترے انجان

ہنس ہنس جن میں جھانکا مَیں نے

نَین ترے انجان

جن سے نَین ٹکرا کر مُکھ پر پھُوٹ پڑی مسکان

کتنے نَین ترے انجان

کہیں نہ ایسا ہو ـــــــ

ان کارے نینوں میں اِک دن جھلک اُٹھے پہچان!

مَن کی تہہ میں پڑے دمکتے جو ہیرے ہر آن

پھر سے نیر میں ڈھل جائیں گے آئے گا طوفان

مَیں شاید اتنا روؤں گی

دھرتی جل تھل ہو جائے گی

گریبان بھیگے گا تیرا

مت ہونا حیران

دیکھو، مت ہونا حیران

یہ جو ہیں دو نین تمھارے

اننتے پیارے

شیتل جھیل سمان

کبھی تو دِل میں کوئی الاؤ بھڑکتا ہو گا

لپٹوں کو ٹھنڈک میں بدل کر

رہتے ہیں یہ نین شانت مدرا کے پیالے

ان نینوں میں

کبھی کبھی

کوندے کی طرح لپک اُٹھتی ہے

دو دھاری تلوار

چناؤ کا آنے والا پَل

وِش میں بجھی کٹار

کِسی دن پر کھو گئے

تمھارے دِل میں کتنا پیار

قرۃ العین

اری تجھے شراپ لگا
لیکھ ترا جنم برھ
برھ نہیں روگ ، جان!
برھ نہیں روگ .....

پرکھوں کا پاپ تھا
جگ جگ کا قرض چکا
چاندی میں تل نہ سکی
تو نہ بنی بندنی
کھیتی تری دیہہ کی
سونی سنسان

دیہہ نہیں دیہہ جان

دیہہ نہیں دیہہ

تری سوچ ، ترے بول

سوکھی تری دیہہ

کھیتی تری دیہہ کی

ہری بھری لہک رہی

سُندری

سُہاگنی

رُوپ متی

سرسوتی

بِرہ رَین کاٹ رہی مان بھری سیج پر

جل بل کر سُلگ رہی اُڑاتی چنگاریاں

جُگنُو سی چمک رہیں

دُور دُور ـــــ!

کافر ہیں ــــ!

اِس دھرتی پر کب برسے گی برکھا رُت کی نرم پھوار

کِن باتوں پر

افسانوں پر ــــ

چار طرف ہے ہاہا کار ــــ!

اس کی ضمانت مانگ رہے ہیں

کوئی نیا پیغام نہ سُن لیں

ننگے پاؤں، بھوکے ہاری

گلی گلی بے حیا بھکاری

موٹی گردن والے افسر

توندیں سہلاتے بیوپاری

جیون بھر ذلّت اور خواری

اس کے بدلے نانِ شبینہ

(وُہ بھی کسی کسی کو ملے گی)

تم بھی میاں کس دھیان میں بیٹھے

نیر بہاتے ہو بے کار

اِس دھرتی پر ——!!

تیس جنم ساگر میں

چڑھا چندرما

رَین کا مَسلا مَیلا پلُّو بھیگ چلا

زوم زوم چلتی ہیں ہوائیں ساگر ٹھاٹھیں مار رہا

لہروں کی سواگت کو گھاٹ پہ مِرا جنم دن آج کھڑا ——

مَیں وُہ روڑھی، چھلی ڈال جس کا رس تُونے چُوس لیا

پتّہ پتّہ تیس جنم دن لہر لہر پہ دِیے بہا

کالے جل میں ڈوبا میرا جنم آج کچھ پُوچھ رہا

او ساگر

او امر پِتا!

ترے جوار بھاٹا کی گرج سے گونج رہا سارا آکاش

چُلّو بھر کر تیرا کڑوا، نمکیلا جل مَیں نے پیا
تُو میرے بھیتر بھی باہر بھی، تُو ہے یُگ یُگ پر پھیلا
تِری بوند سے پھُوٹا جیون، تِری کوکھ نے جنم دِیا
تِری بھِینچی مٹّی کے بھنّور سے، بِپھر بِپھر کر اُبل رہے ہیں
نِیلی نسوں کے جال، لوتھڑے لال ماس کے

سر سر کرتے خون کے دھارے
بانہیں ٹانگیں ہاتھ اُنگلیاں
پریم، کامنائیں، آشائیں
کلا، چیتنا، جیو آتما!

سر سر کرتے خُون کے دھارے آنسُو آنسُو چھلک رہے ہیں
تیس جنم دن ترے کنارے بانہہ پسارے بِلک رہے ہیں

پھِسلی پُتلی دیکھ رہی ہے لہر لہر جیون بہتا

گھاٹ پہ مَیں چُپ چاپ کھڑی ہوں
سوچ رہی ہُوں

وُہ سب کیا تھا ——

اسی بھنوَر میں چکراتا تھا

گیتا اور قرآن کا دھوکا

شاستروں کے گیان کا دھوکا

جوگی کے نِروان کا دھوکا

اور یہ آخری ——

(بہت جو ہم کو پیارا تھا)

اپنی کوِتا کے مان کا دھوکا

دُور دُور تک دیکھ رہی ہُوں جھاگ جھاگ سچ جیون کا

کٹے پھٹے دن، چھلنی راتیں ڈُوب ڈُوب کر اُبھر رہی ہیں

کچّی عمر کی پھُول آشائیں پتّی پتّی بکھر رہی ہیں

اِک ننھّی سی بھٹّی اوڑھنی، انگ بھُوک سے گہنائے

تنگ گلی میں بند جھروکے جن میں آتما گھُٹ جائے

آرزوؤں کے ننھّے بالک سانس بھی جو نہیں لے پائے

دُور تلک چوڑی کے کھروںچے جن سے لہُو رِستا جائے

جھک سپید ہو اگن پیار کی مُنہ کلونچ سے بھر جائے

جیون پھل ، رس سے بوجھل ، ڈالی یہ جھولتا گل جائے
لہُو لال پھُولوں کی پرت کو چُپکے چُپکے گھُن کھائے
برس برس سے کونپل پھُوٹے ، راکھ بنے اور جھڑ جائے
لہر لہر نت نئے مہاجن دَھن کے لیے مُنہ پھیلائے
چبا رہے بچپن کا بھولپن ، چاٹیں خُون جوانی کا
ساگر تیرا پاگل جھاگ لہُو کی ہولی کھیل رہا
سَنسنا رہی رات گھنیری چلّاتی ہے لال ہَوا
اس خُونی ناٹک کے پیچھے بنیا کون چھُپا بیٹھا !

او بنیے رے بنیے ـــــــ !

بنیے رے او بنیے تُو نے کبھی دیا نہیں پُورا تول
بول تو ٹکڑا ٹکڑا کیسا لگا ہمارے ماس کا مول
اب نہیں کچھ بھی باقی آ رے ، آ ، لے ساری دیہہ ٹٹول
انگارہ انگارہ ہاڑ سلگتا ہے ، اس ہاڑ کو تول
چنگاری چنگاری پہ چٹخ چٹخ کر آج رہی یہ بول

جیون ترا اُدھار نہیں تھا جس کا کبھی چُکے ہی نہ مول

جیون ترا ادھار نہیں تھا!

جیون سارا میرا تھا ——!

اس دھرتی پر ہنسی کا ساگر، سُکھ کا کنارا میرا تھا

دُور ہی دُور بہا ہونٹوں سے جو جل سارا میرا تھا

جس کی بوند کو ترسایا وُہ رس کا دھارا میرا تھا

ترے سامنے ہرا جنم ادھیکار ہنس رہا لے پہچان

بنیے ترا جال اب ٹُوٹا بنیے تو بھی گیا ہے جان

تری تول بھی جھُوٹی تھی اور ترے مول بھی جھُوٹے ہیں

جوالا بن کر کھولیں گے جو آنسُو آنکھ سے ٹُوٹے ہیں

ساون بیت گیا

آیا کاتک
بیتا جیٹھ
رُوکھا چیت گیا
ساون بیت گیا

ساون بیت گیا
ساجن کب آیا

ہائے وہ پہلی پہلی برکھا
سوندھی کھِلے گلُاب کی باس
جس کا میٹھا میٹھا موہ

جس میں رچا نگورا ماس
سو بھی مُرجھایا
ساون بیت گیا

ساون بیت گیا
ساجن کب آیا

ڈھل گئے نکھرے ہُوئے سویرے
تھم گئے دوپہروں کے سانس
بُجھ گئی سانجھ کی گھُلتی لالی
بے کل رہی رَین کی پیاس
رستہ دِکھلایا
ساون بیت گیا

ساون بیت گیا
ساجن کب آیا

مجھ سے پُوچھے میری بپاس

تُو نے کیوں بھوگا بن باس

سُوکھے نینوں ہی میں نیر

کاڑھ رہی دھرتی پہ لکیر

مَن میں آئے کڑوی سوچ

او رے جیون دیکھ کسی نے

کیا تجھ سے پایا ——

اتنا ترسایا

اتنا ترسایا

راج سنگھاسن

انقلاب کے راج سنگھاسن پر براجتے گنوانو.....

تم کیا دو گے گیان مجھے !

مجھ کو سیدھی راہ دِکھانے والو

اتنا پہچانو

تم کرسی پر بیٹھے ہو

اور مَیں دھرتی پر کھڑی ہوئی ہوں

اپنے راجیہ مندر کی چوکھٹ سے مجھ کو لوٹاتے ہو ؟

میری تھالی میں تو میرے گرم لہو کا دیپ جلا ہے

دِل کی کوری مٹّی سے جو پھُوٹا ہے وُہ پھُول کِھلا ہے

تم کیا دو گے گیان

سنبھالو اپنے شوالے

شاستروں کو رَٹ رَٹ کر جو تم نے جیون بھر میں نہ سیکھا

وُہ اِک ناری نے اپنے گھائل تن میں محسوس کِیا ہے

روٹی، کپڑا اور مکان!

گیّا مری ہمار
رے دیّا
گیّا مری ہمار ——!

وہ ہریالی
بھولی بھالی
بڑی نمرتا سے دُکھ سُکھ میں
ہاتھ ہمارے چاٹنے والی
اس کی پِیٹھ سوار
رے دیّا
جُلمی تھانیدار

رے دیّا

گیّا مری ہمار

گیّا کے تھن لپٹا چیونٹا

پر ماکھن اور دودھ کہاں تھا؟

ہریالی کا سوکھا سپنا

چبا چبا کر، اُگل اُگل کر

گیّا کا تھن سُوکھ گیا تھا

کوئی نہ بچھڑا جن پائی وہ

گابھن ہو ہر بار

رے دیّا

گیّا مری ہمار

لہُو کی ایک تال ہے ___

لہُو کی ایک تال ہے
رگوں کے سُرخ جال میں
مچل مچل کے دَوڑتے لہُو کی گرم تال میں
یہ بھید کیا !
یہ بات کیا !
کہ جیسے ساحلوں پہ دُور دُور کوئی شور ہے
یہ مَوجِ بحر کف اُڑا رہی ہے کس کے واسطے !

ذرا سی جو یہ جان ہے
جو کُونج سی اڑان ہے
یہ کُونج پنکھ پھڑپھڑا رہی ہے کس کے واسطے

___

تمھارے دو نینوں کا دھیان

سویرا بن کر بکھرا

ٹہنیوں سے کرنوں کا جال اُتر آیا سبزے پہ

رات کی اوس میں بھیگا سبزہ

تلوے سہلاتا

لہراتا

سرسر کرتا

بدلتی رُت نرمائی

دبے پاؤں پت جھڑ چلتا ہے گھاس پہ
دمک اُٹھی ہیں سونا رنگ لکیریں دُور دُور

اُجالے کی چوسر

تن سہلاتی پُروا

اور ٹھنڈی اوس ——

تمھارے دو نینوں کا دھیان مرے دل میں آتا ہے
اٹل دُوری کے سناٹوں میں نرم ہَوا چلتی ہے
دبے پاؤں پت جھڑ چلتا ہے گھاس پہ
دمک اُٹھی ہیں سونا رنگ لکیریں دُور دُور

——————

ایک بہت ہی سیدھی بات

ہر ناری کے مَن میں چھُپی ہے ایک پُرانی ابھیلاشا
مَن چاہے مَنُش کے ساتھ پھرے، گھُومے
بارش میں بھیگے
سردی سے کانپے
گرمی جھیلے
مٹّی سے کھیلے
مٹّی کو بھی بھید بتائے
ناری کو شرمیلا کہنے والوں کو شرمائے
اور سوچے اپنی کوکھ میں پلنے والے جیو کا نام!

پر دیوانی ابھیلاشا کے ہاتھ پڑی زنجیر
جس سے بندھی تقدیر
جس میں اُلجھے محل دو محلے، غالیچے، دربان
بجلی سے چلنے والا اٹڑم کھٹڑم سامان
مُورکھ پرشوں کا ارمان

یہ تو بدن کا ہے ایمان!
غالیچوں کے ساتھ بھلا ناری کب تک سوئے گی
بے شک رات کی تنہائی میں چھُپ چھُپ کر روئے گی

بہت ہَوا میں اُڑی ، لَوٹ دھرتی پر آئی

کیا جانوں کس خوشبو نے یہ سوچ جگائی

جُھوٹ ہَوا کے سُن سُن اب تو مُسکاتی ہُوں

پتّا نیا نکور ، گیت لکھتی جاتی ہُوں

تم کہتے ہو گیت مرے اب بکھر گئے ہیں

مَیں جانوں اب بول رُوپ سے نکھر گئے ہیں

پہلے —— تنہائی سے آتی تھی ابکائی ——

باسی جیون جُھوٹ کلیجہ کُھرچا تا تھا

چبا چبا کر نگلا دن اُلٹا آتا تھا

اب جو گھور رَین میں آنکھیں جھپکاتی ہُوں
تنہائی کا ہاتھ تھامتی ہُوں
پہلو میں بٹھلاتی ہُوں
تبھی چمک اُٹھتے ہیں نَین میں دِیے ہزار !!

دِیے چندرما کے ٹکڑوں کے
ان ٹم ٹم کرتے مکھڑوں کے
جہاں تہاں جو دھرتی پر اُگتے آتے ہیں
کھڑکی کھڑکی ، جھری جھری سے جھانک رہے ہیں
مانگ رہے ہیں دُودھ کے پیالے
پر دھرتی پر دُودھ کہاں ہے !

ہریالی کا سوکھا سپنا چبا چبا کر
اُگل اُگل کر
گائے کا تھن سُوکھ گیا ہے

اب یہ بالک آگ بگولے
جنگل کاٹ رہے ہیں ، پربت کھود رہے ہیں

ڈھول اُڑاتے شہر شہر ہیں آنے والے
جہاں بک رہے اپنے جیون اس منڈی کو ڈھانے والے

اخباروں میں لیکھک ڈر ڈر روز یہ لکھتے
ان کے دَل کے دَل پربت سے اُتر رہے ہیں

(ناتمام)

ست رنگی دھنک کمان

ست رنگی دھنک کمان تک
وہ سیڑھی لگا کے چڑھتا تھا
پر یکدم سیڑھی ختم ہُوئی
اب کچُھ نیچے ہے نہ کچُھ اُوپر !

وُہ دھنک یہیں لہراتی تھی
وُہ ابھی تو اُسے بُلاتی تھی
ہاتھوں میں آکر پھسل گئی
نیلے آکاش میں پگھل گئی

اب چُپ چُپ ہے حیران کھڑا
اور بوڑھی آنکھوں سے تکتا
سانسوں کی ڈوری میں اُلجھا
سیڑھی کے سرے پر جھُول رہا
جیون کی کمائی اِک بنگلہ
آنسوؤں کا حاصل ـــــ اِک موٹر

گیت

دیکھو ری موری جھولی میں چمکے لعل

دمکتی ایسے، بھٹکتی جیسے، مورے آنچل میں
کرن چونچال

گلی میں کھڑی کھیلے، بلائیں دھرتی لے، پَوَن لے جُھک کے
چُنَریا سنبھال

کوئل سی بولے، پتنگ سی ڈولے، پَوَن سنگ ہولے
اُڑاتی بال

چٹک کر بولے، ہٹوں پر رولے، چلتّر بھولے
مورنی چال

ہمیں ہی چھلے چھوری، چھڑائے جوراجوری، کلائی گوری گوری
جھٹک کر بال

جھانک چھُپ جائے، تنک پاس آئے، کھڑی اِٹھلائے
لچکتی ڈال

پیچھے سے جو مَیں آ لوُں، چوری سے لپٹا لوُں، ہتھیلی کا مزا لوُں
چوُم کر گال

گلاب سی سانسیں، کتاب سی آنکھیں، جواب سی کایا
جنم سے سوال

بسے رے مورا آنگن، ہنسے رے مورا بچپن، دِکھائیں جیسے درپن
گزرتے سال

جنم کی پوُجا، یہ تلسی پودا، اُتار رہی میّا
آرتی تھال

بڑھتی نار

تُجھ سے لپٹ کر، اے مری جان
ڈر سے سُوکھ گئے مرے آنسو
سہم گئی میری مُسکان
تُجھ سے لپٹ کر ــــــ

میری دو ہاتھوں میں سمائی ساگر کی بھرپُور اُٹھان !
سارے موسم کِھل کِھل ہنستے ترے لہُو میں گونج رہے ہیں
ترے بدن میں اگن ہوا اور پانی مل کر جھُوم رہے ہیں
اُجیالے ماتھے پر اُگتا پہلی سوچ کا سچا سُورج
بڑھتی نار

تُو اِس دھرتی پر جیون کا سب سے اُونچا مان

یہ تیرے بے خوف چمکتے نین، اندھیروں سے انجان

ڈر سے سُوکھ گئے میرے آنسُو

سہم گئی میری مُسکان

دیکھو، دیکھو، آنے والے پل میں کیا ہونے والا ہے

چار اور سے سرک رہے ہیں کالے، بوجھل، اندھے سائے

کیا ایسا ممکن ہے ———

ایسا ہو سکتا ہے؟

لہریں بھرتے ساگر کو کوئی پتھرا دے

لچکیلے تن کی گیلی لکڑی میں چتا اگن بھڑکا دے

سُورج پر کالک مَل دے

نرمل کرنوں کا گلا دبا دے!

ایسا ہی ہوتا آیا ہے

ہو سکتا ہے!

نہیں، نہیں او دھرتی کی دھی

اپنی شکتی آپ سنبھال

ان بُوڑھی کُبڑی صدیوں کو ناچ دِکھا دے

تانڈو ناچ

اس گندے ، ناپاک ، پیس بھرے ، نیلے لہُو کو بہہ جانے دے

جس نے جیون بانجھ کیا ہے

سوچ کا سب رَس چُوس لیا ہے

چِھل جانے دے اپنا تن بھی

تیرے نئے جوان لہُو کی لالی جہاں جہاں بکھرے گی

دھرتی رَس سے بھر جائے گی

تب پھُوٹے گی پہلی کونپل

پیار کی کونپل !

سُکھ کا راجہ تجھ سے لپٹ کر تیرے ہونٹ کا بوسہ لے گا

سب تن شیتل ہو جائے گا ، جہاں جہاں وہ ہاتھ دھرے گا

سندھ

کالی گاڑھی دلدل چُپ ہے
سنّاٹا چھوں اور
چُپ کا گہرا بھید
چُپ کا اُور نہ چھُور

دائیں بائیں منڈراتی ہے
گدھ کی خُونی چونچ
گدھ کی آنکھیں لال
اُوپر اُڑے جہاز

گاڑھی دلدل پھڑک رہی ہے

جیسے کچی کوکھ

کوکھ سے اُگتا ماس

سانت کے جنمے سندھی گبھرو تیرا مُکھڑا لال

کالی آنکھیں کھول

سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے مُنہ سے کچھ مت بول

باقی ہیں دو ہاتھ

جمنوں کی دَلدَل کی شکتی جن میں دَوڑ رہی ہے

جو لوہے سے تیرا توڑا رشتہ جوڑ رہی ہے

گِدھ کیا جانے سنّاٹے نے جنا کوئی انسان

اب جو تری مُٹھی میں جکڑے، سو ہر پل بلوان

ساتھ سمے کو لے

کل تیرا ہی ہے

جاپ

آ، مِرے اندر آ

پوتر مہران کے پانی

ٹھنڈے میٹھے مٹیالے پانی

مٹیالے، جیون رنگ جل

دھو دے سارا کرودھ کپٹ

شہروں کی دشاؤں کا سب چھل

یُوں سینچ مجھے، کر دے میری مٹی جل تھل

ترے تلھ کی کالی، چکنی مٹّی سے

ماتھے پر تلک لگاؤں

ہاتھ جوڑ ڈنڈوت کروں

او من کے بھید سے گہرے
ہولے ہولے سانس کھینچتے

اوم سمان امر
او مہان ساگر
مَیں اُتری تیرے ٹھنڈے جل میں کمر کمر
تیرے ٹھنڈے، میٹھے، مہربان پانی سے مُنہ دھولُوں
اور دھولُوں آنسو
کھارے آنسو
تیرے میٹھے پانی سے دھولُوں

او مہان مٹیالے ساگر، آ
سُن مری کتھا
مَیں بڑی ابھاگن، بھاگ مرا
بے درد ہاتھ میں رہا سدا
ٹُوٹا مرا مٹّی سے ناتہ
کیسے ٹُوٹا!
اِک آندھی بڑی بھیانک، لال چڑیل

مجھے لے اُڑی

اُٹھاکر پٹکا اس نے کہاں سے کہاں!

تیرے چرنوں میں سیس جھکاتی ایک اکیلی جان

مرے ساتھ مرا کوئی میت نہیں

کوئی رنگ رُوپ، کوئی پریت نہیں

مری ان گڑھ، پھیکی، مُرجھاتی بولی میں کوئی سنگیت نہیں

مری پیڑھیوں کے بیتے جُگ میرے ساتھ نہیں

بس اک نردئی دھرم ہے

جس کا بھرم نہیں!

وُہ دھرم، جو کہتا ہے مٹّی مری بیرن ہے

جو مجھے سکھاتا ہے ساگر مرا دُشمن ہے

ہاں، دُور کہیں

آکاش کی اونچائی سے پرے

رہتا ہے خُدا

اتنا رُوکھا!

مٹّی سے جوڑ نہیں جس کا

سب ناتے پریت اور بیر کے اس کی کارن مَیں کیسے جوڑوں

مَیں مٹّی مرا جنم مٹّی

مَیں مٹّی کو کیسے چھوڑوں

او مٹیالے، بلوان مہاساگر

مَیں اُکھڑی دھرتی سے

بھگوان! مرا رس سُوکھ گیا

پھر بھی سُنتی ہُوں اپنے لہُو میں بِیتے سمے کی نرم دھمک

وُہ سمے، جو میرے جنم سے پہلے بِیت گیا

مرے کانوں میں

اِک شور ہے جھر جھر بہتے ندّی نالوں کا

اور کوئی مہک بڑی بے کل ہے

جو گونج بنی مری چھاتی سے ٹکراتی ہے

او مہان ساگر

جیون رَس دے

اپنے تلھ میں جل پودا بن کر جڑ لینے دے

سدا جیے

او مہان ساگر سندھو

تو سدا جیے

اور جیئیں ترے پانی میں پھسلتی مچھلیاں

شانت، سُکھی، یُونہی

ترے پانی میں ناؤ کھیتے

ترے بالک، سدا جیئیں

او پالن ہار ہمارے

دھرتی کے رکھوالے

اَن داتا

تری دھرتی

نرم، ریتلی، مہربان سندھ کی دھرتی

سدا جیے

کیا تم پُورا چاند نہ دیکھو گے ؟

اِنتساب

اپنے دل کا کھنکتا سِکّہ

جو تم ہر صُبح سُورج کے ساتھ ہَوا میں اُچھالتے ہو

اگر خوف کے رُخ پر گرے، تو یہ مت بُھلانا

کہ شجاعت اسی کے دوسرے رُخ پر کندہ ہے

سو، یہ ایک داؤ بھی اس بازی کے نام

جو ہم نے بدی ہے، زندگی سے .....

کاغذ، تیرا رنگ فق کیوں ہوگیا؟

"شاعر، تیرے تیور دیکھ کر"

کاغذ، تیرے رخسار پر یہ داغ کیسے ہیں

"شاعر، مَیں تیرے آنسو پی نہ سکا"

کاغذ، مَیں تجھ سے سچ کہوں.....

"شاعر! میرا دِل پھٹ جائے گا"

پہلا باب

آج میرے اندر کوئی استعارہ صرف تھکن سے مر گیا ہے
لفظ حیران کھڑے ہیں
اور قافیہ ہاتھ چھڑا کر چلا گیا ہے
بنجر ہو گئی ہے زمین
اور وزن — مُنھ کے بل گر پڑا ہے
کہاں کھو گیا میرا آہنگ ؟
آدھے راستے میں . . . .

کیا تُو بھی —
میری شاعری ، تُو بھی ؟
مُنھ پھیر لے گی ؟ آنکھیں چُرائے گی ؟

کیا تُو بھی نصیحتوں کے نقشین کٹوروں میں
بے حیائی اور آبرُو ریزی کی پنی تُلی خوراک پیش کرے گی ؟
میرے ہمدردوں اور خیر خواہوں کی مانند
جو اِس تپتی دوپہر میں
اپنے ٹھنڈک کمروں میں محوِ آرام ہیں
اُکتا چکے ہیں جو کشمکش کے اس طویل اور یکساں ڈرامے سے ،
اور اب پردہ گرانا چاہتے ہیں —
وُہ کہتے ہیں
"بدن تو ایک مہمان سرائے ہے
بیس برس ، پچیس برس بعد
یہاں کوئی آبستا ہے
جو نفع نقصان کا حساب کرتا ہے
اور گھاٹے کا ہر سودا منسوخ کر دیتا ہے"
بے شک ٹھیک کہتے ہوں گے
لیکن وائے مجبوری !

میرے بدن میں میری پُرانی رُوح نے قبضہ کر لیا ہے

مَیں دھکّے دے کر اُسے نکال نہیں سکتی
یہ چمٹ جاتی ہے میرے مساموں سے
زور آزمائی کرتی ہے
مجھے جھنجھوڑ کر یوں پٹخ دیتی ہے
کہ مَیں ہنس کر ہار جاتی ہُوں
اور کہتی ہُوں آنسوؤں کی بولی میں
"اچھا! تُو جیتی، جنم جلی.....!"

میری رُوح سیدھی ہے، تم اسے ٹیڑھے سانچے میں کیسے
سمو سکتے ہو!

مَیں اسے موڑ توڑ نہیں سکتی
یہ مجھے افتاں و خیزاں رکھتی ہے
بدن کو دھکیلتی، سنگ دل شاہراہوں پر
ٹوٹے جوتے کی کیل بن کر
میرے تلووں سے باتیں کرتی رہتی ہے
شہر کی اس کشادہ شاہراہ پر
شاندار امریکی سفارت خانہ کے سامنے

جہاں دو رویہ گھنے سبز درختوں کا سایہ ہے
یہ مجھے بیچ کی چلچلاتی دُھوپ میں چلاتی ہے
مَیں چلی جا رہی ہُوں، اپنے مقسوم کا بوجھا ڈھوتی
اپنے دَور کی دیواروں سے سر پٹختی
مَیں چلی جا رہی ہُوں اپنے پسینے میں بہتی
دھوپ میں چلتے چلتے عہد کرتی ہُوں
میں ایک رزمیہ لکھوں گی
جنگجو شہ سواروں کی ٹاپوں سے دھمکتا
قیامت خیز طوفانوں سے گرجتا
بجلیوں کے کوڑے پھٹکاتا ہُوا
خُوں آشام تلواروں کی جھنکار لیے
شعلے اور انگارے برساتا

میرا قلم اسے گائے گا

اور وہ

میرے ہزار جسموں کے تلملاتے خون سے رنگا
سُرخا سُرخ پرچم بن کر

سڑکوں پر دُور دُور تک جھولے گا

میرا رزمیہ ہزار بم بن کر پھٹے گا

اور پتّھر کی طرح ٹھنڈے ستم کا یہ پورا کاک محل ڈھا دے گا

اس کا ملبہ پوری دھرتی پر بکھر جائے گا

دُھول ہی دُھول اُڑے گی

اِتراتی اونچی عمارتوں کے پتّھر سجدے میں گر جائیں گے

اور ان اونچی ماڑیوں میں

قوم کی گدّیوں پر سجے یہ مونچھ کے پُتلے

خاک میں دب جائیں گے ہمیشہ کے لیے

ان کے جیتھڑے بھی نہ مل سکیں گے

اور چیتھڑے تو یہ اب بھی ہیں

کرسیوں سے بندھے ہوئے

ہر صبح کوئی پُر اسرار ہاتھ دیوار سے اُگتا ہے

ان سے ان کی کرسیاں چھڑکا کر

انھیں پھر واپس باندھ دیتا ہے

کہ یہ دن بھر سرسراتے اور پھنکارتے رہیں

عین تمھارے چہروں پہ

ان کے میلے اور مہین وجود

مکّاری سے تمھارے سوکھے حلق میں گھُس جاتے ہیں

تمھارا دم گھونٹنے کے لیے

سرسراہٹ ..... سرسراہٹ!

یہاں تک کہ تم پاگل ہو جاؤ

یہ رینگتے ہیں تمھارے بدن پہ

لال چیونٹیوں کی طرح

مینڈکوں کی طرح ٹرّاتے ہیں

چھلانگیں مارتے ہیں اور غوطے لگاتے ہیں

کِسی غیر انسانی بولی میں

کوئی غیر انسانی بات ہے

جو یہ بار بار مجھ سے کہہ رہے ہیں

مَیں یہ کیسے مانوں؟

مَیں تو اسے سمجھ تک نہیں سکتی!

مَیں چلی جا رہی ہوں

ارادوں کو دانتوں میں پیستی
سمیٹتی اپنے منتشر ہوتے وجود کو
جو بار بار بل کھا کر
میری پیشانی کی گرہ بن گیا ہے

مَیں مُنھ اندھیرے نکلی تھی

اور اب
دن ڈھلنے کو آیا
دیکھو ـــــ مَیں نے کہیں تھم کر سانس بھی
نہیں لی ہے
مَیں بیٹھی ہوں سمجھوتوں کے سائبانوں میں
پیر لڑکھڑاتے ہیں، ٹھوکر لگتی ہے
تو مَیں اپنا عہد دوہراتی ہُوں ـــــ
بارُود کا گیت لکھنے کا عہد
لیکن ـــــ

میرے دوست
مَیں تھک بھی جاتی ہوں!

کیا یہ سُن کر تم مایوس ہو گئے

نہیں، نہیں، میرے ساتھی

مجھے سب کچُھ سچ سچ بتانے دو

مجھے کچُھ بھی مت چھُپانے دو

سب کچُھ —— پُورا سچ !

ڈرو مت، پُورا سچ بدصورت نہیں ہوتا

اس میں جو کچُھ بد نما ہے

وُہ تو چاند کے داغ کی مانند ہے

کیا تم پُورا چاند نہ دیکھو گے ؟

کیا تم نے کبھی خوف کی شکل دیکھی ہے ؟

—— شاید کسی نے بھی نہیں دیکھی

اس کا چہرہ سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوتا ہے

اور ہاتھوں میں انجانے حکم نامے ہوتے ہیں

جن کی تعمیل ——

بھیانک خواب کی مانند

بے جوڑ اور مبہم ہے

اس وقت یہ کبھی نظر نہیں آتا

جب مقابلہ کا لمحہ حقیقت بنے

اور تم دانت بھینچے اس لمحہ سے گتھم گتھا ہو

اپنے قہر کا قطرہ قطرہ چوس کر

گھناؤنے لمحہ کی آنکھوں سے آنکھیں لڑا دو

اور تھوک دو اس کے چہرہ پر

ہزار جنموں کی حقارت منھ میں بھر کے

اس وقت . . . . . یہ دروازے کے پیچھے چھُپ جاتا ہے

یہ تو بہت بعد کی بات ہے

آخری پولیس تفتیش کے بہت بعد کی بات

فراغت کا کوئی نایاب لمحہ،

سکون کی کوئی گھڑی

دبے پاؤں یہ نکلتا ہے تب کمیں گاہ سے

تھکن سے غنودہ آنکھوں کے سامنے

اچانک تھرتھرا کر

تمہارے سینہ پر برفیلا ہاتھ رکھ دیتا ہے

اور تمھارا دل اچھل کر حلق میں آپھنستا ہے

صرف ایک اچانک آہٹ!
اور دماغ سائرن کی چیخ بن گیا
پولس!

اور—

اس کے بعد.....

دروازے پر ہر دستک
سیڑھیوں پر ہر قدم کی چاپ
گلی میں ہر آہٹ
درد سے دھڑکتے سر میں ایک ہی خیال لاتی ہے
پولیس—پولیس—پولیس!
اسے پیرونایا کہتے ہیں
علامتیں سمجھ گئے تو خوش قسمت ہو
سکون اور گولیاں کار آمد ہیں
وہم سے نجات کے لیے!
لیکن یہ کیا!

تمھارے بیکل اعصاب نے

ابھی تو جذب بھی نہ کی تھی

طبیبوں کی مہربانی

کہ ایک دن اچانک

"ٹھک ٹھک ٹھک"

اور دروازے پہ

وہم، حقیقت کی منحوس وردی پہنے پھر کھڑا ہے

چھوڑئیے ڈاکٹر صاحب

گولیاں بھلا کیا کر سکتی ہیں!

اس مرض کا علاج

یہ گولیاں نہیں

کبھی تم نے ایک میز پہ بیٹھ کر

سرکاری مخبر کے ساتھ چائے پی ہے؟

جب وُہ بھی جان لے

کہ تم جانتے ہو

وہ بات کہ تم کہہ نہیں سکتے

پھر بھی وہ سُن سکتا ہے

پھر چائے کی پیالیوں میں کیا رہ گیا؟

کیا برف کا ٹکڑا؟

اسے حلق سے اُتارنا ہے

ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہو

اور وہ بے چارہ، پیٹ کا مارا

وہ بھی ہنس رہا ہے شرمندگی سے

تم سے بڑھ کر مضطرب نظر آتا ہے

زیادہ تربیت یافتہ نہیں شاید!

اے خُدا، عزّتوں اور ذِلّتوں کے

مخبری کی تربیت کے لیے

کِتنا ایک عرصہ کافی ہوتا ہوگا؟

ایک سال، ایک دن؟

یا ایک لمحہ، دباؤ سے کمزور پڑا؟

کیا یہ ممکن نہ تھا

کہ تم اسے نہ پہچانتے

کیا یہ کہیں زیادہ بہتر نہ ہوتا ؟
مگر اب تو وہ پھیکی ہنسی ہنستا
رنجیدہ آنکھیں پھڑپھڑاتا
باتیں کیے جاتا ہے ، کیے جاتا ہے
یہاں تک کہ تمھاری بے چینی
تھکن سے پتھرا جائے
یہاں تک کہ تمھیں رونا آنے لگے
اور ہاتھ پھڑکنے لگیں
اسے جھنجھوڑنے کے لیے چیخیں مارتے ہوئے
بدنصیب ! بدنصیب !

لیکن اس کے بعد گھر جاتے ہُوئے
ہر گلی کے موڑ پر
ہر چوراہے تک پہنچ کر
تم مُڑ کر نہیں دیکھتے
کوئی تمھارا تعاقب کر رہا ہے
کوئی تم پر نظر رکھ رہا ہے

اعصابی سکون کی دوا ؟

مزید گولیاں ؟

ٹھیک ہے، میرے دوست

لیکن اسے محض وہم سمجھنے کی غلطی

بار بار دوہرائی نہ جاسکے گی

ہم آنکھیں کیوں جُھکا لیتے ہیں ؟

تمھاری خاکی وردیوں سے بھری، غرّاتی ٹرک

جب بھی ہمارا راستہ کاٹتی ہے

ہماری نظریں کیوں گڑ جاتی ہیں زمین میں ؟

اے زمین ! ہمیں جواب دے

ہم نے تجھے آنسوؤں کی چلمن سے دیکھا ہے

وردیوں سے بھری ٹرک گزر رہی ہے

اطمینان کا بھونپو بجاتی ہُوئی

ایک دِل میں —

ایک تپتے دِل میں

مچلی ہے پگلا ہٹ

زمین پر پڑا پتھّر منتظر نظر آتا ہے

اسے کوئی ہاتھ میں اُٹھالے کیا ؟

زور سے دے مارے اس وردیوں سے بھری ٹرک پر

شاید، ان کے اندر

کہیں کسی گریبان میں

کوئی دِل بھی ہو گا

جو چھن سے بج اُٹھے گا

ایک تنہا، نہتّی آرزُو مچل رہی ہے

ایک دل میں

ایک ہزار دِلوں میں

بے شمار دِلوں میں

کروڑوں دِلوں میں دھڑکتی ہُوئی

حلقوموں میں پھنستی ہُوئی

مگر پھر بھی تنہا

مجبور ! مجبور !

نہیں اُس ٹرک میں کوئی دل نہیں

نہیں، اس میں صرف وردیاں بھی نہیں

اس میں بندوقیں ہیں

اور ان کی گولیاں دِلوں سے ٹکراتی ہیں

تب آوازیں سُنتی نہیں

یہ تو آوازوں کو ہلاک کرنے کے لیے ہی چلائی جاتی ہیں

ایک تنہا، نہتّی آرزو مچل رہی ہے

اور دَم توڑ رہی ہے

جب تک کہ یہ ٹرک گزرے

تجھے یُوں ہی چلنا ہے

زمین پر نظریں گھسیٹتے ہُوئے

لوگ پاگل کیوں ہو جاتے ہیں

یہ بات ہمیں سمجھاتے ہُوئے

"زن" سے نہیں گزرتی

نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی

آہستہ آہستہ جا رہی ہے بے فکری سے
آس پاس پر آوازے کستی ہوئی
راہرو بے بسی سے راستہ چھوڑ رہے ہیں
نیلامی کپڑے پہننے والی یہ مخلوق !
بے بس، نہتّی اور اس لیے نیچ
بھلا کر بھی کیا سکتی ہے !

پان بیڑی کی دُکان پر
سلگتی لٹکی ہے ایک پتلی سی رسّی
کھانستے، کھنکارتے، مدقوق بوڑھے نے
رسّی سے سگریٹ سلگائی ہے
اور مُنھ پھیر کر تھُوکا ہے

زمین
اپنے بچّوں کے دلوں کے ہر بھید کی امین
زمین، پیاری ماں
مسکرانے لگی ہے، ہنس پڑی ہے

آنسوؤں کی چلمن سے مَیں نے دیکھی یہ مسکان

میّا!

تُو اپنے گونگے بچّوں کا ہر اشارہ سمجھتی ہے

تُو مُسکراتی ہے

تو لے،

میرے آنسُو بھی ہنس پڑے ہیں

کیونکہ میرے وطن میں

کل کھُل کر رونے پر پابندی لگائی گئی تھی

مگر آج کھُل کر ہنسنا بھی منع ہے

اور ہم —

جو نہ رو سکتے ہیں، اور نہ ہنس سکتے ہیں

صرف تم کو ہی دیکھتے ہیں

تو جو ہماری رازداں ہے

اے سرزمینِ وطن!

دوسرا باب

عدالتیں کسی بھی طرح کی ہوں
سرسری ہی ہوتی ہیں
میرے دیس میں

تمھارا کرم مہربانو!
کہ تم نے مجھے جلتی آنکھوں
یہ محشر کا عالم دکھا دیا
دھکم پیل، گھبرائے قدم
ہراساں چہرے!

ہمارے صدیوں سے مجرم وجود پر

کمپنی بہادر نے ایسی قانونی پھبتی کسی
کہ یہ بے ڈول، بوسیدہ عمارت
کیڑا کھائے لکّڑ دانت نکالے
آج تک منھ پھاڑے ہنس رہی ہے

چہ شک!
ڈرامہ کامیاب ہے
اور سیٹ مکمّل
کالے کوٹوں میں وکیل
منڈیروں پر کائیں کائیں کر رہے ہیں
بھُوکے بچّے کے ہاتھ سے نوالہ جھپٹنے کو تیار...

بھیڑ کے بیچوں بیچ پھر رہے ہیں
کچھ وردی پوش فرشتے
مونچھوں پر تاؤ دیتے ہُوئے
کچھ بے نیازی سے
پھر بھی پس منظر کی موسیقی کے لیے

ہتھ کڑیاں ضرور چھنکا دیتے ہیں
نیم تاریک کمروں میں
بے حرمت کاغذوں کے ڈھیر خاک چاٹ رہے ہیں
بوڑھی میزوں کو پوشش نصیب نہیں
انتظامی عجلت میں
ننگی ہی نکل آئی ہیں
اور ان کے پیچھے بیٹھی ہے
سرکاری محکموں کی زائیدہ
وہ عجوبہ مخلوق
جو شاید صرف میرے دیس میں پائی جاتی ہے
منشی اور اہل کار ــــ
نیولوں کے چہروں پر
لالچ اور دھونس سے دھندلائی
فوجی ٹرک گزر رہی ہے
لومڑیوں کی آنکھیں لگائے
سستی سے تاڑ رہے ہیں

یہ کسمساتی جونکیں
افسروں کے بوٹوں تلے روز کچلی جاتی ہیں
یہ بے اختیار، بے بس کٹھ پتلیاں!
مگر —— ان کے بس میں کچھ تو ہے
یہ تمھارا خون چوس سکتے ہیں
تمھارے فق چہرہ کو دلی مسرّت سے بھانپتے ہیں
اور تخمینہ لگاتے ہیں ——
"کس میں لہو کی بوند بچی ہے"!
"اسے مَیں کس طرح چوسوں"!
ان کے چہرے مسرّت سے سُرخ ہو جاتے ہیں
وُہ اُکتاہٹ مٹانے کے لیے آوازہ لگاتے ہیں
"اللہ رکھا —— وغیرہ"!
"بندو خان —— وغیرہ"!

"وغیرہ" ہڑبڑا کر صفوں سے نکل رہے ہیں
سُوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے
مَیلے بوسیدہ دامن جھاڑتے

بدنصیب معصوم

محرومیوں اور نامرادیوں سے جھنجھلا کر

آپس میں لڑ پڑنے والے

بچّوں کی طرح ہاتھا پائی اور سر پھٹوّل کرتے ہیں

یا بھوک کی ڈھٹائی سے

اونے پونے خوانچے سروں پر اٹھائے

جا بیٹھتے ہیں ممنوعہ مقامات پر

شُرفا کی زندگی حرام کرنے

یہ کتنے بے ہنگم ہیں!

کتنے ٹیڑھے میڑھے ہیں

ان کے لیے قانون کا ایک ہی دائرہ سچ مُچ کافی نہ تھا

کر ملکہ کا پرانا قانون

اُنھیں دیکھ کر چکرا جاتا تھا

تو پھر شریعت کا قانون لایا گیا ہے

لیکن اگر شریعت انھیں دیکھ کر رو پڑے

اور گلے لگا لے ان کو

ان کے خاک میں لتھڑے چہرے

چومنے لگے دیوانہ وار

تو پھر سمری ملٹری کورٹ کیونکر نہ ہوتا

بس یہی ایک دائرہ ہے

جو اِس کندۂ ناتراش کو

بندوق کے کندے سے تراشے گا

کیا تم نے کبھی عوام کو دیکھا ہے ؟

کیا تمھیں کبھی وہ

حکمراں کی تقریر

اور اخبار کی سُرخی سے باہر ملا ہے ؟

اگر نہیں —

تو کسی دن سٹی کورٹ آجاؤ

اسی میدانِ حشر میں وُہ پا بہ زنجیر ایستادہ ہے

اور اُس پر

غنڈہ گردی ، چار سو بیسی اور نقضِ امن کے مقدمات

زیرِ سماعت ہیں

مَیں بھی باری کی منتظر ہُوں
بیٹھی ہوں بولائی بھکارنوں کے ساتھ
جو ہنکا کر لائی گئیں
غیر قانونی بھیک مانگنے کے جرم میں!

غیر قانونی بھیک!
جاہل، نادان بھکارنو!
کیا تم نہیں جانتیں
بھیک تو قانونی بھی نہیں مانگی جاتی
ظِلّ الٰہی کے ہاتھ میں کشکولِ گدائی سہی
مگر وہ بھیک نہیں مانگ رہے
بھیک؟ ایسی تو کوئی چیز ہی نہیں جانِ من
کچھ سودے اتنے شرمناک ہوتے ہیں
کشکول کی آڑ ضروری ہو جاتی ہے
کشکول کی دھول تمھاری آنکھوں میں پڑتی ہے
تم سراسیمہ اور پست ہو کر
آنکھیں مَلتے رہ جاتے ہو

نہیں دیکھ پاتے وہ سودا

کہ تمھاری رگوں میں جما خُون کھَول اُٹھّے

کہ ہزار جنموں کی ذِلّت

تمھارے سینہ میں دھماکہ بن کر پھٹ پڑے

اور تمھارے یہ مرجھائے، سوکھے تانت وجود

بَل کھا جائیں آہنی تاروں کی طرح

اور جکڑ لیں ان بردہ فروشوں کو

غیظ و غضب کے فولادی شکنجے میں

جو تمھاری نسلوں کو بیچ کر کھا گئے

بیچ رہے ہیں تمھاری بھُوک

بیچ رہے ہیں تمھاری روز و شب کی محنت

یہ کشاکشِ روزگار!

جس کا کوئی انت نہیں

تمھارے خواب.....

لیکن — تم خواب دیکھتے ہی کب ہو

اتنا مَیں نے جانا ہے

جنتا سپنا نہیں دیکھتی

صرف سچ دیکھتی ہے

آج کے کڑوے سچ میں

کل کے آسرے کا پیوند

دیکھو ــــــ ظالموں نے اسے بھی اکھاڑ پھینکا

افسران مسکرا رہے ہیں

اُف ! اتنی دبیز مسکراہٹ !!

بے بسی کے پردے میں عیّاری

اور عیّاری تو خود ایک پردہ ہے

بے بسی کا !

پرت در پرت

یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا

اِنھی دو عناصر کو گوندھ کر

تاریخ نے ہمارا افسر گھڑا ہے

" اخّاہ ! تو آپ ہیں وہ شاعرہ !!"

افسوس، آپ کن جھمیلوں میں پڑ گئیں!"

مَیں اکیلی کھڑی ہُوں
اور میری آنکھوں میں ہے
وہ زرد ریگزار
کراں تا کراں محیط
جھلستا ریگزار
جو گونج رہا ہے
بگولوں کی غراہٹوں سے
یہاں صرف "مَیں" ہُوں
اور پھر "مَیں" ہُوں
اپنی جانب نگراں
یہ میرا ویرانۂ ذات ہے
ہاں ـــــ یہیں جنمی تھی میری شاعری
اسی بیابان میں
ریت کے ساتھ ساتھ دہکتی تھی
اور چلچلاتی دُھوپ میں پگھل کر

آئینہ ہو گئی تھی

مَیں نے شعر لکھا
اپنے آنسوؤں سے!
بلک بلک کر لکھا
خون کی بوندوں سے نقطے ڈالے
اپنے گوشت کو چیر پھاڑ کر ریشے نکالے
اور انھیں قافیہ میں باندھا
بے بسی کے ناخنوں سے
مَیں نے اپنی ہتھیلی پر شعر گودا
اور تمھیں دکھایا
تم غلیظ ہنسی ہنس پڑے
"آہا ہا ـــــ ننگی شاعری!"
تم نے کہا
اور میرے کلام سے فحاشی کرنے لگے
مَیں سر پٹکتی رہ گئی
مَیں سر پٹکتی رہ گئی

ان گیلے دعوت ناموں پہ
جو بے حیائی سے مجھے بُلا رہے تھے
تموّل کی چربی پر پھسلنے کے لیے
اور تمھاری مرغّن محفلوں میں جا گرنے کے لیے

مایوسی کی دلدل میں
شاید مَیں ڈوب ہی جاتی . . . .
مجھے تو کیچڑ نے تھاما
"مَیں کیچڑ ہُوں"
اس نے پیار سے کہا
'بدبو دار گلیوں میں رہتی ہُوں'
'مَیں تیرے دیس کی دھرتی پہ
گاؤں گاؤں بکھری ہُوں'

مَیں کیچڑ ہُوں
کُرۂ ارض پر دھرتی کا سب سے پہلا رُوپ
مَیں صبر کرکے پتھّرتی ہُوں

اور پیار کر کے وادی
مہربانی کے سبزہ سے سینہ ڈھانپ کر
مَیں نے دو دھیلے گندم کے خزانے لٹا دِیے
ہیرے، لعل، جواہر بن گئے
اور رگوں میں سونا چاندی پگھلنے لگا

ایکا کر کے پہاڑ کون بنا ؟
اجتماعی عزم کی مانند سینہ چوڑا کیے
سربلند، اٹل !
دھرتی پر مَیں ہی کھڑی ہُوں
تم اپنے دَور کے برفانی زمانوں میں جنمی سہی
پر ذرا مجھے اپنی اوک میں بھرو
مجھے محسوس کرو
مَیں کیچڑ ہُوں
فلک بوس پہاڑوں کا سیّال !
مَیں دل ہی دل میں لاوا بناتی ہوں
میری آج کی کمزور، بے بضاعت پھسلن

قیامت خیز زلزلوں کا امکان ہے

کیچڑ میں ڈوب کر
مَیں پھر سانس لینے لگی
مَیں جب شکست خوردہ تھی
حالات کے پنجے میں بے بسی سے اشک بار
تب تم میری داد دیتے نہ تھکتے تھے !!
لیکن اب ——
جب مَیں نے جھٹک دیا ہے ناطاقتی کو
اپنے بازوؤں سے
اور موڑ دیا ہے حالات کا پنجہ
اپنی نہتّی کلائی کے بل
جب میری جنم جنم کی حسرت نے
اپنی دھرتی کی محرومیوں کی جانب دیکھا
اور روتی ہُوئی یوں ان کے گلے جا لگی
جیسے بیٹی بچھڑی ماں سے لپٹ جائے
تب تم اتنے خوفزدہ ہو گئے ہو !

تم نے میرے پیچھے پولیس لگا دی ہے !!
سمن اور وارنٹ جاری کرتے ہو !!
اپنے سارے خوف کی رسّیوں کو بٹ کر
مقدموں کی پھانسی میرے سر پہ جھلانے لگے ہو !!

بغاوت کا مقدمہ !!
بات تو ہنسی کی ہے — لیکن ...
یہ تو ایک گونج ہے میرے بچپن کی
کسی نے کہا تھا
"تم باغی ہو"
اور آخر کار
میری نافرمانی کو سینے سے لگا لیا تھا
وہ میری ماں تھی
تاریخ بھی میری ماں ہے
اس نے مجھے ذات کے اندھیرے غار میں آلیا
"لکھّو —"
اُس نے کہا

"مَیں جاہل ہُوں!"

"نہیں لکھ سکتی"

مَیں نے خوف سے کانپتے ہُوئے کہا

تب اس نے میرے سرد بدن کو اپنی آغوش میں بھینچا

اور پھر کہا

"لکھو ___ خلقت کا نام لے کر

جو زمینوں پر محیط ہے

اور زمانوں تک رواں ہے

جو عظیم ہے اور کبیر ہے

جو اس پُوری پھیلتی دھرتی کی مالک ہے"

اور میرا نطق رواں ہو گیا

مَیں گواہی دیتی ہُوں

اپنے مظلوم لوگوں کی دلیری کی

مَیں گواہی دیتی ہُوں

ان کی فتحِ مبیں کی

مَیں گواہی دیتی ہُوں!

کیا تم میرے گلے میں جے مالا ڈالنا چاہتے ہو؟

اپنے بچّے کو کاندھوں پہ بٹھا کر
مَیں نے اس کی ٹانگوں کا لمس
اپنی گردن پر محسوس کیا ہے

اب
کبھی کبھی خیال آتا ہے
پھانسی کا پھندہ
کیا ایسا ہی لگتا ہو گا!!

مَیں کون ؟
ایک معمولی عورت!
"مَیں ہنستے ہوئے پھانسی میں جھول جاؤں گی"
ایسا نہیں لکھ سکتی
لکھنا چاہوں تو قلم شرمندہ ہو جائے گا
مَیں شاعر ہوں سچّائی کی
میرے حقیقتوں سے لبریز جام میں

بوند بھر مبالغہ کی بھی گنجائش نہیں
لیکن اتنا جانتی ہوں نادانو !
مَیں انسان ہُوں ــــ ایک انسان
جانتے ہو؟ انسان کیا ہوتا ہے ؟
سنو ، اور خوف سے پیلے پڑ جاؤ
انسان ــــ شہید کا امکان ہے

جو بات آج دِل میں آتے ہُوئے بھی
اپنے ممکنہ جھُوٹ پر شرماتی ہے
کیا عجب کہ کل ہونٹوں تک آ پہنچے
اور وہ بھی اِس شان سے
کہ سچ بن کر !

چاہو تو آزما بھی سکتے ہو
شاید ، خود میرے اندر
دُور ــــ کہیں وجود کے پاتال میں
ایک تجسس سا خوابیدہ ہے

اپنا امکان ماپنے کا.....

مَیں چلی جا رہی ہُوں ــــ مگر
یہ کون سا مقام ہے
ہر طرف 'راستہ بند ہے'، کی تختیاں آویزاں ہیں
کیا مَیں یہیں کھڑی رہوں ؟
اور تمھارا انتظار کروں ؟
میرے لوگو ــــ
اپنے بچّوں کی اُنگلی تھامے ہُوئے
اور سنبھالے ہُوئے مختصر زادِ راہ
کاغذ کے یہ ٹکڑے
جن پر مَیں نے پیار بھرے پیغام لِکھے ہیں
زندگی کے نام
نظموں اور گیتوں کے رُوپ میں

تیسرا باب

'چاند....!'

"لال... وہ دیکھو"

"چندا..."

چاندنی اس کی آنکھوں میں گھول کر
مَیں اپنے بیٹے کو کیوں سُلاتی ہُوں؟
کیا اس لیے کہ صُبح ہونے پر
تمھاری ہوس کے دہکتے تندور میں جھونک دوں اسے؟
خونخوار درندوں سے بھرے جنگل میں
جہاں بھیڑیے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں
مَیں اپنے بچّے کو کِس طرح چھوڑ دُوں!!

آہ! جیون کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں

جن کی تکمیل

تجوریوں پر براجمان ساہوکار

گندی دھوتیوں کی گانٹھ میں باندھے بیٹھے ہیں

اور پیلے دانت نکالے

کھجا رہے ہیں پھوڑوں بھری رانیں

نوزائیدہ انسانیت کی عصمت دری کرنے کو بے تاب

اور میں

آنکھیں موند کر دھکیل دوں اپنے لال کو

ان پختہ مجرموں کے نرغے میں!

ایسا کیونکر ہو سکتا ہے

ازل سے

جو میرے خیالوں کی پکڑ سے بھی پرے ہے

جب سے دھرتی کی پہلی جاندار کوکھ میں

پہلا تخم پھل لایا

جننے والیوں نے بچوں کی حفاظت کی ہے

اپنی ادھوری سدھوری سمجھ سے

انھیں آگ، پانی اور جھکڑوں سے بچایا ہے

غاروں اور درختوں کی کھوہوں میں چُھپ کر

برسوں تک انھیں ایسی انوکھی لگن سے پالا ہے

جو ہر نئی صُبح نیند سے تازہ دم اٹھی

یہاں تک کہ وہ

اپنی مضبوط ٹانگوں پر کھڑے ہو جائیں

اور بڑے بڑے ڈگ بھرتے چل دیں

اپنا نکورا بیج، کسی نکوری کوکھ میں بوتے

ہنستی اور بسورتی ماؤں کو چھوڑ کر

خوشی اور غم کے پینگیں بھرتے جُھولنے میں

پھر بھی وہ بُوڑھے بازو اُٹھ ہی جاتے ہیں

بے اختیار

اپنے کوکھ جنوں کو، اپنے سینے سے لگانے کے لیے

بچانے کے لیے

جیسے ایک پل جنم دیتا ہے دوسرے پل کو

اور وقت بن جاتا ہے
جیون بن میں ممتا کی ندی بے آواز بہتی ہے
گزرتی ہُوئی زمانوں سے زمانوں تک
خاموش ــــ بے زبان
مگر سدا لبریز
یہ لہریں جو اُبھرتی ہیں اور گزرتی ہیں
یہ عورتیں ہیں بچّوں والیاں

میرے بے کل پانیوں میں بھی میرے لال
تیری ننھّی منّی کاغذ کی ناؤ ڈول رہی ہے
کورا کاغذ ــــ جس پہ کچُھ نہیں لکھا
نہیں! کچُھ بھی نہیں
تیرا مقسوم بھی نہیں
اگر سفّاک زمانہ نے تیرا مقسوم لکھا بھی ہے
تو مَیں اسے مٹا دوں گی
دھو ڈالوں گی اس کا ایک ایک سنگدل لفظ
خواہ اس کوشش میں

میرا آنسوؤں سے نمکین

اور پیار سے بوجھل پانی

خون سے سُرخ ہی کیوں نہ ہو جائے

تُو آدھی رات کو اُٹھ گیا ہے

ناسمجھ ہاتھوں سے مجھے سہلاتا

اپنی میٹھی بولی میں کیا کہتا ہے چندا ؟

"اُٹھو ! صُبح ہو گئی . . ."

ابھی کہاں میرے لال

ابھی کہاں !

دیکھو — کتنا اندھیرا ہے

رات آتی ہے

وقت کے لب پہ دُزدیدہ آہ کی مانند

اور دن کا آنسو بے اختیار

آسمان کے رُخسار پر ڈھلک جاتا ہے

میرے وطن کا اُفق کس قدر افسردہ ہے

برسوں سے یہی تماشا دیکھ رہے ہیں

رات جن رہی ہے رات کو
پیدائش کے عمل کو کس نے مسخ کر دیا !
کیا یہ نظر بندی کا کمال ہے ؟
یہ سُورج سیاہ کیوں ہے ؟
نابینا آسمان
خلقت کے انبوہ میں راستہ ٹٹول رہا ہے

کیا مَیں اسے روزِ روشن کہوں
کہ تپتے آسمان پہ چیل نے چکّر کاٹا ہے
اور شاہراہوں کے جال میں
ٹریفک کا زخمی درندہ غرّانے لگا
بازاروں میں
برآمدی اشیا کی شہوت آنکھیں مَلتی ہُوئی بیدار ہو رہی ہے
قوّتِ خرید !!
کوتوال کی مُنہ چڑھی فاحشہ
دیکھو کیسے دندناتی پھر رہی ہے
مَیلی ، سُوکھی مائیں

کوڑے کے ڈھیر میں ہڈیاں ڈھونڈ رہی ہیں

بلبلاتے بچوں کو

خاموش کر دینے کے لیے

•

شہروں کے بے حرمت جسموں پر

پلازوں اور مینشنوں کے پھوڑے نکل رہے ہیں

کالے دھن کی فیصلہ کُن جیت کے جھنڈے گاڑتے

کل کے اخباروں میں ان کے اشتہار دیکھ لینا

تمھاری مفلسی پر قہقہہ لگاتا ہُوا

تم اپنا سر ٹکراؤ ــــ بلکہ کاٹ کر پھینک دو

اپنی مقتول آرزوؤں کے قبرستان میں

ہم تمھاری کھوپڑیوں سے ایک مینار چُنیں گے

اور اس کا کوئی چلتا ہُوا سا نام رکھیں گے

"گلزارِ مُصطفیٰ"

"ھٰذا من فضلِ ربّی"

یا ایسا ہی کوئی گرما گرم نام

کیونکہ کاروبار گرم ہے

کیونکر گرم ہے یہ کاروبار؟

اس مکروہ شہر پر رونق کیونکر آئی ہے؟

کیونکر کیا ہے اس مدقوقہ نے بناؤ سنگھار!

پچکے گالوں پر غازہ اور سرخی تھوپی ہے

جہنمی بیماریوں سے سڑتے بدن پر

ریشمی لباس سجایا ہے

اور اب جھومر جھپکا لگائے چونچلے کرتی ہے

آخر کیسے؟

ہمارے لاعلاج افلاس کے نیج بجاتے کیڑے

تڑپ تڑپ کر پوچھ رہے ہیں

یہ ایک بھیانک راز ہے

جو سب جانتے ہیں اور کوئی نہیں بتاتا

ہر طرف مجرمانہ سرگوشیاں پھنکار رہی ہیں

راتوں رات پیسہ بنانے کی

بڑا ہاتھ مارنے کی

"تیر نہیں تو تکہ ہی سہی"

"بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی"

اور اب تو وہ بھی کھل گئی ہے

اب اندھیر نگری میں چوپٹ راجہ کی ضیافت ہوگی

حرمزدگی کی رسّی دراز ہے

آؤ اس سے معیارِ زندگی کی پھانسی بناؤ

اور افلاس کے مجرموں کو چوراہوں پر لٹکا دو

معیشت کی چکّی گھومتی رہے

اوندھی یا سیدھی یہ مت سوچو

ہم انسان کو پیس کر بونا بنا رہے ہیں

ایہاالشیخ ، ہمارے کارنامہ کی داد دیجیے

بخشش ! یا اخی !

آپ کے مقدس پیٹرو ڈالر کی قسم !

ہماری عربی کے بے محل اعراب پر نہ جائیے

ذرا مخرج کی گہرائی دیکھیے

جو حلق کی جگہ ہمارے معدہ سے برآمد ہوا ہے

صبح کے اخبار گلا پھاڑ کر چلّا رہے ہیں

سنہرا موقع! آخری سنہرا موقع!!

دوڑو! پکڑو! جانے نہ پائے...

اور خلقت بدحواس ہو کر دوڑ پڑی

کچلتی اور روندتی ہُوئی اپنے آپ کو

زندگی شاعری کے مُنھ پر تھُوک رہی ہے

میرے معبود! یہ کِس گناہ کی سزا ہے

یہ تُو نے کیا قہر کیا!

میرے ہاتھ میں قلم تھما دیا

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں!!

بندرگاہوں پر شام ہچکیاں لے رہی ہے

میرے دیس کے آخری کنارے

تُو کِس کے قدموں سے لپٹ کر رو پڑا ہے

رزق کی تلاش میں تیرے پُوت

پہاڑوں اور وادیوں سے ڈھل ڈھل کر

آ رہے ہیں لہروں میں

رات کی رات تیری گودیوں میں سونے کو
دوسری صبح اُنھیں بہت دُور جانا ہے
آسروں کے بے کنار صحراؤں میں
خوشحالی کے سراب بُلا رہے ہیں
مت رو ، اور انھیں دوش نہ دے
تیرے یہ فرزند
نہ بے وفا تھے ، نہ بے ہُنر
یہ تو لوہار تھے اور کمہار تھے
یہ کاریگر ، دستکار تھے
عُسرت نے ہُنرمند ہاتھ کاٹ دیے
یہ جا رہے ہیں
چاک پر برتن ادھورا چھوڑ کر
کرگے پر تانی اُلجھی چھوڑ کر
ایک چادر تھی
کہ مفلسی کی آبرُو ڈھانپ لیتی تھی
اب اس کا بھی تار سے تار نہیں ملتا

مجبوریاں آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی ہیں
آقاؤں نے آنسوؤں کے دام کھرے کیے
اور تیرے دامن کے موتیوں کو
گرد کی طرح جھاڑ دیا

جانے والوں کی قطاریں اُفق میں ڈُوب گئیں
جہازوں کے آہنی پنکھ
وطن کی مانگ کا سیندور پونچھ رہے ہیں
ہمارا ہراول دستہ کہاں ہے ؟
ہمارا ہراول دستہ.....

سب کچھ جُوں کا تُوں رکھنے کے لیے
تم نے ٹینک گھُما دیے میری سڑکوں پر !
سب کچھ جُوں کا تُوں رکھنے کے لیے
تم نے بندوق تان لی میرے سینے پر !
میرا سینہ !
جو گہوارہ ہے ان حسین گلابوں کا

جو کل تمھارے بچّوں کے سینوں میں خیال بن کر کھِلنے والے تھے

تم نے اُلٹا لٹکا دیا زمانوں کے علوم کو

تم نے انسانیت کو برہنہ کر کے کوڑے مارے

اور دردمند دِلوں سے اُٹھتی دُعاؤں کے ہاتھ کاٹ دیے

کیوں ؟

آخر کیوں ؟

آہ اِس دھرتی کی قومی شاہراہوں پر

اس دِن کا منحوس سایہ آج بھی منجمد ہے

جب تمھاری جارح طاقت نے

دیس کی گود میں ہمکتے شہروں کی

کڑی سے کڑی ، ہاتھ سے ہاتھ چھُڑا دیے تھے

صُبح دم

مسافروں سے بھری بس ایک شہر سے چلی

اور دوسرے شہر تک پہنچ نہ پائی

تمھاری تلاشیوں سے پہلے

سُوٹ کیس ، سفری تھیلے اور گٹھریاں

شرم اور صدمہ سے مُہر بہ لب تھیں
مادرِ وطن نے آنکھیں نیچی کر لی تھیں
اور دیکھ رہی تھی
صرف بندوق کے جنبش کرتے ہُوئے دستہ کو
وقت نے ہونٹ سی لیے تھے
مبادا دھرتی کی دلدوز چیخ اس لبس میں نہ گونج اُٹھے

تم سب کچُھ کھول کھول کر دیکھتے رہے
مگر کچُھ بھی ضبط نہ کر پائے

نہیں مٹا سکے وُہ دُکھی دانشمند آنکھیں
جن میں آنسُو مشکل سے روکے گئے
اور نہ ضبط کر سکے وُہ آبرومند پیشانیاں
جن پر نفرت کی گہری شکنیں گڑ گئی تھیں
اور نہ قبضہ میں لے سکے وُہ خشک ہونٹ
جو کاٹ لیے گئے تھے
بپھرتے غصّہ کا پیغام تم تک پہنچانے کے لیے

ہائے اس لمحہ کی دہشت ناک خاموشی

جب بھری بس کو سانپ سونگھ گیا تھا

صرف یہی ایک لمحہ

مشکل ترین وقت میں

مجھے طاقت دے دیتا ہے

کہ میں نے اس خاموشی کو صرف سُنا ہی نہ تھا

میں نے اُسے سمجھا بھی تھا

لبّیک! لبّیک! میرے لوگو ——

شاعر نے تمھاری صدا سُن لی ہے

چوتھا باب

کِتنا اندھیرا ہے ...

بے آواز ، بے وزن

ایک اندھی خَلا

مَیں کُرسی کے ٹھٹھرے بازوؤں سے جکڑی بیٹھی ہُوں

اور تیَر رہی ہُوں سیاہ خلا میں

جو کچُھ کہتی ہُوں ، اُسے خود بھی سُن نہیں سکتی

سوالوں کے بے آواز تاریک سیّارے

اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں

"کیا تم اس شخص کو جانتی ہو ؟"

"کیسے ؟"

"کب سے؟"

"کیا یہ غدّار نہیں؟"

"یہ کیونکر غدّار نہیں؟"

اس کمرہ کی چوکھٹ تک
لفظوں کے کچھ معنی تھے
میرے پاس تو لفظوں کا بھرا خرمن تھا
لیکن میرے لفظ وردی پوش نہ تھے
یہاں آنے کا ان کو اجازت نامہ نہ ملے گا
مَیں نے ایسا کب جانا تھا
جب تک تم ان سے ان کی شرافت کا لباس نہ چھین لو
جب تک تم اپنی رنگین، نوکدار ٹوپیاں نہ پہنا دو
کہ وہ اُچھلتے رہیں اور قلابازیاں لگائیں
مُنھ پر نیلے، نارنجی رنگ ملے
اپنے صریحاً لاحاصل ہونے پر تالیاں بجاتے ہوئے
مَیں ان مسخروں کو اپنے ساتھ نہ لائی تھی،
تم نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر سجا لیا ہے

مگر مَیں تمھارے ناٹک کی اداکار نہ تھی

نہیں بولنا چاہتی اپنے مکالمے

صرف تمھارا منظر نامہ پُورا کرنے کے لیے

یہ کمرہ چہرہ ہے پھانسی کے ملزم کا

جس پر سیاہ نقاب چڑھا دیا گیا ہے

میرا دَم گھُٹ رہا ہے

یہ نقاب اُتار دو ـــــ اُتار دو!!

کیا یہ ڈرامہ کا آخری سین ہے

کیا تم نے اپنے مکالمے دُرست ادا کیے؟

فوجی عدالت اُکتا کر اونگھ رہی ہے

مَیں بھی اونگھ رہی ہُوں تھکن سے

اور خواب دیکھتی ہُوں

ایک بڑے سجیلے روشن آسمان کا

ایک لمحہ نے اُلٹی اُڑان بھری

اور گمبھیر تاریکی سے اچانک نکل آیا!

سرمئی، نارنجی، گلابی افق

برق رفتاری سے گزرنے لگے

دن ، مہینے ، برس ، آندھیوں کی طرح اُڑ رہے ہیں

یہ آسمان کس قدر نکھرا ہُوا ہے

جہاں مفرور لمحہ منڈلایا ہے

شاید بارش ابھی ابھی تھمی ہے

نقرئی بادلوں میں فرشتوں کے پر پھڑپھڑاتے ہیں

اور ہَوا بانسری بجا رہی ہے

یہ دوست کی آواز کہاں سے آرہی ہے

درسگاہ کے تالاب میں نیلا کمل کھِلاتی

یہ بھرپور ، سیراب ، لمحۂ نمو !

یہیں سُرخ پتھر کی سِل پر

مَیں دیکھ سکتی ہوں

ایک نوخیز لڑکی

ایک خطرناک کام میں ہمہ تن غرق

کتاب پڑھتی ہُوئی

جولیس فیوچک کی ڈائری

"پھانسی کے سائے میں"

اس پل وہ ہاتھ اسے کہاں یاد ہے
جس نے یہ کتاب اسے تھما دی تھی
مگر ہتھکڑی میں پہچان سکتی ہے
کہ جھنکار تو اس میں تب بھی تھی

درسگاہ میں تالاب کے کنارے
ایک لڑکی کتاب پڑھتی ہے
وسیع سرزمینِ وطن پر ایک نسل
ڈھونڈتی تھی لفظوں کی ہجّے میں
کسی ناممکن کا امکان
کم سنی، شعور سے واقف نہیں
علم و دانش نہیں
مگر جذبۂ دل گنگنانے لگا ہے
آنکھ چھلکی ہے، لب تھرتھرائے ہیں
زندگی نے تو پہلے ہی
مفلسی اور یتیمی کے دو دھاری خنجر سے

شق کر دیا تھا سینہ
اب خیالوں نے کچھ حرف پھونکے ہیں
تو — فیصلہ ہو گیا
کورے ماتھے پہ قسّام نے
مُہر ثبت کر دی
"جا تجھے عشق بخشا گیا"
اب ابد تک اسے اپنے چہرہ پہ مجنوں کی آنکھیں لگا کر
زندگی کی طرف دیکھنا ہے
وقت کے ریگزاروں میں
ہر آنے والے محمل کی جانب لپکتا ہے
نئی سحر کے پیامبر آئیں گے
نئی سحر کے پیامبر.....!

لوٹتے وقت

اس لمحۂ پرفشاں کو کیا ہو گیا!
کسی بھبکتی ہُوئی آگ سے اس کے پر جل گئے
اب وہ تیتری کی مانند اُڑ نہیں رہا

چیونٹی کی جون میں رینگنے لگا ہے

یہاں کس قدر دُھوپ ہے

یہاں کیسی لُو چل رہی ہے

دُکھوں اور مصائب کی چنگاریاں بکھیرتی

تپتی دھرتی پہ خلقت گھوم رہی ہے

ہانپتی اور کراہتی

نئی سحر کے پیامبر کہاں ہیں؟

نئی سحر کے پیامبر.....

ہائیں! یہ کیا!!

کیا یہی.....!

بستیوں سے پرے

خلقت کی بِھیڑ سے دُور

ایک تنگ نظر گوشہ میں

بہتّر فرقے دست و گریباں ہیں

نئی سحَر کے پیامبروں کے

مُنھ سے کف اُڑا رہے ہیں

داڑھیاں نوچ رہے ہیں ایک دوسرے کی

خرچ رہے ہیں اپنی پوری طاقت

ایک دوسرے کو فحش گالیاں سنانے میں

وقت .....

بجلی کی ریل بنا، دھڑدھڑاتا گزر گیا

کتنی نسلیں پٹڑیوں پر کٹ گئیں

ان کے مان، ان کے بھرم کے لہو سے

روزانہ اخباروں کی سرخیاں تر بتر ہیں

اور یہ

وقت سے بے نیاز

ابھی تک گتھم گتھا ہیں

نامردی کی جھنجھلاہٹ میں

کورعقلی سے ایک دوسرے کو کوستے ہوئے

اور نہیں جانتے

کہ دیکھنے والے شرم سے گڑے جا رہے ہیں

جس طرح خارش کا مریض

سب کے سامنے اپنا آپا نوچ پھینکے۔

بند کرو! بند کرو بے حیائی کا یہ تماشا

کیا تم نے ہماری چیخیں نہیں سُنیں؟؟

اُف یہ نقب زنی!!

کون تھے وہ ہتیارے

جو لُوٹ لے گئے ہماری پُونجی!

منصفِ کائنات! اپنی دوزخ کے در کھول دے

تیرے عذابوں کے مستحق

ان سے بڑھ کر کون ہیں؟

کہ جس سرمایہ پر انھوں نے ہاتھ صاف کیا

وہ تو مسکینوں کا تھا!

مجبوروں اور بے سہاروں کا!

مفلسوں اور ناداروں کا!

نوچ لو ان کے سروں سے دانشوری کی پگڑیاں

یہ تو چیتھڑے ہیں ہماری امنگوں کے

یہ ہماری توانائیوں اور امکانات کی دھجّیاں

سروں پر سجائے بیٹھے ہیں!!

عدالت کا وقت ختم ہوگیا

مَیں اب جا رہی ہوں، بولو کیا کہوں؟

پھانسی کا ملزم میری طرف دیکھ رہا ہے

اُمید بھری مسکراہٹ سے

اس سے نظریں مِلانے کی

مُسکرا کر ہاتھ ہِلانے کی

"باہر سب ٹھیک ہے" کہہ سکنے کی

مُجھ میں ہمّت نہیں

مَیں وہ شاعر ہوں جسے سُورج کا قصیدہ لکھنا نصیب نہ ہُوا

اے میرے دیس گواہی دے!

اے دھرتی کے ٹکڑے یاد رکھنا

مَیں نے وُہی لکھا ہے جو سچ تھا

تُو نے مجھے دیا بھی کیا؟

میرے حصّہ میں پھنکارتی رات آئی ہے

غدّاریوں اور دغاؤں سے پُر

ہر قدم پر سنپولیے کُلبلا رہے ہیں

اُف میرے اندر کتنا زہر بھر گیا ہے

آؤ بچّو! تمھیں چوم کر اس کو امرت بنانے کی کوشش کروں

مَیں سانپ بن کر نہیں جی سکتی

اپنے ایمان کے اٹل پتّھر پر

پھن پٹک پٹک کر جان دے دوں گی

پانچواں باب

میرے دیس کے باسیو

بتاؤ، مَیں اب کیا کروں ؟

میرے ترکش کے تیرو

تم کہاں ہو !

مُجھ کو آواز دو

تمھارے لشکر کی سالار مَیں نہ تھی

مَیں تو ایک رجز خواں کے سوا کچُھ بھی نہیں

چاہتی ہوں

میری لَے، تمھارے بدن سنسنا دے

مگر ــــــ میری آواز کو کون گرمائے گا

میرے جذبہ کی آنچ .....

اکیلی تو کچھ بھی نہیں

یونہی سوختہ راکھ بن جائے گی

میرا مرتبہ یہی تھا

کہ مَیں

تمہارے سجے جنگی گھوڑوں کے

جلو میں چلوں

تمہاری شجاعت، ہُنرمندی اور بے جگری کا قصیدہ

میرے حلق میں پھڑپھڑا رہا ہے

مگر مَیں اسے راگ میں کیسے ڈھالوں

تم یونہی ہچکچاتے رہو گے

تو مَیں کیا کروں گی

کس طرح تم کو اپنا کمال دکھاؤں گی !

خیالوں کی پرواز کس بُوتہ پر ؟

کیا تم نہیں جانتے

سب سے اونچی اڑان والا عقاب تک

گرد و پیش کی گرمائی ہواؤں کے بل پر ہی اڑتا ہے

مَیں تمھاری گائیکہ

دِل گرفتہ کھڑی ہُوں

اور دُور دُور تک نظر دوڑاتی ہُوں

آہ! یہ دِل شکن منظر . . .

تمھاری صفیں منتشر ہیں

اور خیموں میں خاک اُڑ رہی ہے

کب تک مَیں اس سُوکھے درخت کے نیچے کھڑی رہوں

یہ راگ، جو مَیں نے برسوں کی ریاضت سے سیکھا ہے

کہ مَیں تمھیں کبھی نہ سُنا پاؤں گی

یونہی نامراد چلی جاؤں گی

تم سے اپنا انعام لیے بغیر؟

تم کو جُھک کر سلام کیے بغیر؟

مَیں چلی جا رہی ہُوں

اور ــــــ اب تو شام ہو گئی

ہَواؤں میں اُڑ رہے ہیں

موسمِ سرما کی آمد کے زرد سندیسے

یہ پیلے پات کیا کہتے ہیں

کیا یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں

کہ دُنیا اپنے محور پر گردش کر رہی ہے

اَنمٹ استقلال سے

مَیں نے دُور کی گرج چمک دیکھی ہے

اور اب سوچ میں ہُوں

یہ دُنیا .....

کیا سچ مُچ ایک ہی دُنیا ہے

چھوٹی اور بڑی دُنیا

دوسری دُنیا اور تیسری دُنیا!

پھر آخر کیوں؟

برسوں سے میری دُنیا

صرف مایوسی کے مدار پر گھوم رہی ہے

"تاریخ کا سفر ویرانوں سے گُزرتا ہے"

یہ ان سے پُوچھو

کہ جنھوں نے بنجر برسوں کا ایک پَل گزارا ہے

ایک، پورے دَور کے سوکھے تھنوں کو نچوڑتے نچوڑتے

ہمارے ناخن تک اُکھڑ گئے ہیں

تم مجھے مت بتاؤ، کتابوں میں کیا لکھا ہے

کہ انسان نے بربریت کی صدیاں جھیل لی ہیں

مَیں اتنا جانتی ہُوں

کہ وقت کا یہ ٹکڑا، جو میری کمر پہ آن گرا

اس قدر جان لیوا ہے

اتنا گراں ہے

کہ میرے اعصاب ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں

اور مَیں اتنا جاننا چاہتی ہُوں

کہ بے حس، سنگدل صدیوں کا جُوا

اپنی گردن سے کیونکر اُتار پھینکوں

آج اور ابھی .....

کیا فقط اس کی ناقابلِ برداشت گرانی کو

مَیں اُس کے عدم کا اشارہ سمجھوں ؟
یا صرف اپنے سوال کی بے تابی کو
اس کا جواب مان لُوں

نہیں ـــــ مجھے بچّوں کی طرح نہ بہلاؤ
مَیں نے دُور کی گرج سُنی ہے
اور آس پاس کی فضا کو سونگھتی ہُوں
برکھا رُت کے آثار کھوجتی ہُوئی
اے زمین، تیری اکائی ثابت سہی
مگر روشن دن اور اندھیری رات کی قسم
تاریخ کی اکائی کو ابھی ثابت ہونا ہے
تمھارے نہتے ہاتھوں سے
میرے دیس کے لوگو !

اے مرے دل
اے مرے بے قرار دل
اس جادُو منڈلی میں سجے چھوٹے بڑے بُتوں پر نہ جا

یہ وقت کی نظر بندی ہے

تیرے دشمن، تجھے سہمانے کے لیے

آج کی زہریلی صورت کا سانپ تیرے مُنھ پر پھینکتے ہیں

مگر ایمان کے دستِ معجزہ گر میں

یہ رسّی بن جاتا ہے

چھوٹا سا رسّی کا ٹکڑا

بس ایک ہاتھ بھر

اور اس کی تمھیں ضرورت تھی

آج کو کل سے جوڑنے کے لیے

اور اس سے تُو کمند ڈالے گا

اس قلعہ کے کنگروں پر

جہاں مستقبل قید ہے

اور رہائی کی خاطر تمھیں پُکار رہا ہے

دُور دُور تک چلتے پھرتے، ڈولتے پھرے

پہاڑوں اور ریگزاروں میں سفر کرتے ہُوئے

اجنبی بولیاں بولتے

دھرتی کے اس ٹکڑے پر
جسے شاید، صرف ریل کی دھڑدھڑاتی پٹڑیوں نے باندھ رکھا ہے

کیا تم نے مجھے پہچانا؟
میرا تم سے کیا ناتہ ہے؟
کیا صرف بیگانگی کا ناتہ؟
تم تو مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھتے
"تم کون؟"

مَیں کون ہوں؟
شاید صرف ایک گھٹیا مذاق
میری نہ کوئی تاریخ ہے نہ جغرافیہ
حالات کے بہاؤ کا اچھالا ہوا سنگریزہ
پھر بھی تم نے مجھ پر شک کیا
اجنبیت کا شک —
لیکن مَیں —
تم پر تو کیا، خود پر شک کرنے سے بھی ماورا ہوں

نہ ہی کسی طرف لڑھک جانا چاہتی ہوں

بس اسی سرزمین پہ چُپ چاپ پڑی ہُوں

زمانوں کی آنکھوں کی پُتلی بن کر

ٹُک ٹُک تمھیں تکتی ہُوئی

تمھارے اُدھڑے پیروں

اور خاک آلود چہرے تکتے ہُوئے

کیا تم مانو گے ——

مَیں خود بخود آنسو بہانے لگی

کیا یہ حیرت کی بات نہیں ؟

کیوں ؟ آخر کیوں ؟

یہ اس سرزمین کی اوّلیں پہیلی ہے

تم اسے بُوجھو !

میرا سراغ ڈھونڈو

لو —— مَیں تمھیں اشارہ دیتی ہُوں

جانِ من ——

ایک بھید ہے اس سینہ میں

بہت پُرانا . . .

تاریخ کے مہا ساگر کی کروڑوں لہروں نے

میرے دِل کی تکونی سیپ ڈھالی ہے

اور اَن گنت مِٹتی اور موجود

تہذیبوں کی ریت نے

گِھس گِھس کر اس سیپی کے پنکھ تراشے ہیں

اتنی باریک مینا کاری کی ہے

کہ ان کے خوردبینی ریشے

تمھارے گیتوں، تمھاری بولیوں

اور تمھاری بھرت کے ٹانکوں میں پیوست ہو گئے ہیں

میرا دِل شاید وہ پھُول تھا

جو اندھیرے میں ہی کھلتا ہے

سو میری بیگانگی بھی تھکی

تمھارے دریا کے کنارے

مَیں بے ہوش پڑی تھی

ہوش سنبھالا . . . . .

تو میرا وطن بن چکا تھا

اخباروں کے کورے ورقوں میں
نوکِ سنگین سے مٹائی خبروں میں
ضبط شُدہ کتابوں میں
اپنے عہد کے شعور میں
میرا وطن ہے
مَیں عصرِ حاضر کی بیٹی ہُوں
تاریخ کے دھارے سے جنمی ہُوں
پہلا قدم تم نے میری سرزمین پر رکھا
اور مجھے اپنا ہم وطن بنا لیا
تم نے مجھے پہچانا
اجنبی دوستو!

مَیں کون؟ تمھاری سنگی
مَیں مہاجر ہُوں
قدرت نے میرے دل کے تہی خول کو

تمھاری امنگوں کے کسے تاروں سے جوڑا

اور بلا کوشش نغمہ رواں ہوگیا

تب کیا یہ صرف ایک شاعر کا دِل تھا؟

سطح پر عِطر کی ایک بوند تَیرتی ہے

مگر ایک بُوند کیا ہے ؟ محض شاعری !

مبادا تم پانی کو نہ سمجھو

جس نے خوشبو کشید کی

یہ راز ہَواؤں نے سُنایا

کورے گھڑے میں ، دُور کی ندی کا پانی

مٹّی کی مہک سے سوندھا ہو ہی جاتا ہے

بھلا کیونکر ایسا نہ ہوتا

یہ نظامِ قدرت ہے

اور وہی تو تمھارے حق میں ہے

جس طرح سُورج کو ڈُوب کر اُبھرنا ہے

آگ کو جلانا اور پانی کو بُجھانا ہے

اسی طرح ہم سفرو!

ایک مہاجر کو بالآخر تمھارا گیت گانا تھا

ورنہ کیونکر رہ پاتا

خوشبو پہ تمھارا ایمان .....!

آخری گیت

میری نظم کی پہلی سطر
آخری سطر کو جانتی تھی
اور ان کے بیچ جو کچھ ہے
اور میرا فن ہے، میرے لوگو!

مَیں تمھاری گایک ہوں
مَیں گاتی ہوں تمھارے نوزائیدہ بچّوں کی بدھائیاں
اور خوبرو دولھاؤں کے سہرے
سہاگ راتوں کے شوخ گیت
مَیں نے ہی تمھیں چھیڑ چھیڑ کر سنائے ہیں
تمھاری مجلسوں میں سوز خوانی کے لیے

مَیں ہی تو آتی ہُوں

خُوب جانتے ہُوئے

کہ میرے بغیر

تمھاری ہر محفل بے رونق رہے گی

مَیں تمھارے گُونگے گیتوں کا

تمھارے لہُو میں ڈھلتے مبہم بولوں کا

جسمانی رُوپ ہُوں

اور تمھارے ادھورے جملوں کا ما فی الضمیر

اپنے جیون کے رنگ برنگے میلہ میں

تم نے مجھے کھیسوں سے سجی کھاٹ پر جگہ دی ہے

پیش کیے ہیں مجھے

اپنی سبز تواضع کے پان

اشتیاق سے مجمع لگایا ہے میرے گرد

پھر کیا مَیں دھرتی کے بھیلے منڈپ کے آداب نہ جانوں گی

جو تاریخ کی حقیقت نے خود رائج کیے

کیا مَیں نہ جانوں گی

کہ ہر شکست کا آخری گیت

ہمیشہ اُمید کا گیت ہوتا ہے

جو تاریخ خود گاتی ہے شاعر کے کلام میں

مَیں جب یاس میں ڈوبتی ہوں

کیا نہیں جانتی تب ؟

کہ مجھے اُبھر آنا ہے دوبارہ

اُمید —

میرے پاس تمھاری امانت ہے

زندگی نے سرِ راہ شاعر کو تھما دی

مَیں خیانت کروں اور تمھیں نہ سونپوں یہ گٹھڑی !

ایسا کیونکر ممکن ہے

میری دھرتی دُکھی سہی ، مگر نراش ؟؟

نہیں نہیں !! بھلا بچّوں والی کا مایوسی سے کیا ناتہ !

اس کی گود کی گرمی آج سے کن کو پیدا کرتی ہے

اگر پُوری رات پڑی ہے

تب بھی ــــ دیکھو

وُہ گوندھ رہی ہے اپنی توانائیوں کو

اور طباق میں ڈھانپ کر رکھ رہی ہے

سویرے کے لیے

کل تم اٹھو گے

مبادا کوئی کسر رہ جائے

مبادا تمھیں دیر ہو !!

رات بھر آپ سے کلام رہا

یہ لو ! باتوں باتوں میں رات کٹ گئی

اُفق میں بکھر گئے کُھل کر

سپید سُوت کے لچھے

کرنوں کی کروڑوں سوئیاں

اِک نئے دن کا اُجالا کاڑھ رہی ہیں

چڑیوں کی جھنکار سے آکاش گونج رہا ہے

اس پل دُنیا کتنی تر و تازہ ہے

کِسی نے ابھی ابھی "کُن" کہا ہے،
اور یہ دھرتی ابھی جنمی ہے
اپنے کروڑوں بیٹوں سمیت
معصوم، بے داغ، خوشیوں سے لبریز

شفیق آسمان
اپنے بچّوں کو پلانے لایا ہے
سُورج کا دودھ بھرا کٹورا
اس سے پہلے کہ دن کے کورے دامن پہ
منافقت لاؤڈ اسپیکروں سے چھینٹے اڑانے لگے
جاگو اے فرزندانِ وطن
ویرانۂ وجود میں وہ اذان دینے کے لیے
کہ سہمی زمین آخری بار تھرتھرا کر شق ہو جائے
اور جرأت کا چشمہ پھوٹ نکلے

لا ریب! نہیں کوئی طاقت ماسوا اللہ کے
اور وہ تمھاری رگِ گلو سے نزدیک تر ہے

پھر خوف کیسا؟
بدّو تک اپنا سرکش اونٹ باندھ کر سوتا ہے

تمھاری دھنواں دھرتی پر
یہ مُنھ زور عفریت
کب سے بلبلاتا پھر رہا ہے
تمھاری کھیتیاں روندتا ہُوا
ہریالی کا ناس کرتا ہُوا
پھر تم کیونکر سو سکتے ہو؟
ہزاروں برس سے یہ ابلیس
شیطانی ہتھکنڈوں سے تمھیں بے بس کرتا آیا ہے
یہاں تک کہ تمھارے بوسیدہ خیمہ میں
یہ پُورا سما گیا ہے
اور تم ویران آنکھیں لیے باہر کھڑے ہو
پھر تم کیونکر سو سکتے ہو
چبا جاتا ہے یہ آسمانی صحیفے
ان کے معانی

تمھارے حافظہ کے لیے چھوڑ کر
صرف تکرار
لایعنیت کی
صرف نَے
اِبہام کی
دماغ کو سُن کر دینے کے لیے
چھین لو اس کے جبڑوں سے اپنے معانی
یہ زندگی کے معانی ہیں
اسی فانی زندگی کے
تم کب تک خُدا کی نعمتوں کو ترسو گے؟

بے سروسامان، مفلس لوگو!
تم ہی تو ہو
سب سے بیش قیمت خزینہ
اس دھنواں دھرتی کا
تم ہر دَور کا پاک و صاف ضمیر ہو
شاطرانہ چالیں تمھیں گمراہ نہیں کر سکتیں

نہ تمھیں رشوت دی جاسکتی ہے

اور نہ خریدنا ممکن ہے

تمھاری بے لاگ عدالت میں

دیر ہوسکتی ہے، مگر اندھیر نہیں

مُنھ پھٹ تاریخ، جو ورق بھر میں

تاجداروں اور سالاروں کو تُوم ڈالتی ہے

ذرا لگی لپٹی اُٹھا نہیں رکھتی

اپنی تلخ کلامی بھُلاکر

تمھاری شان میں

کیسا رُوح پرور قصیدہ گا رہی ہے

تمھارے جلال وجمال نے

اس اختصار پسند کو بھی شاعری سکھادی

نیا دن طلوع ہو رہا ہے

نیا دن ....!

یہی آج کی تازہ خبر ہے

اس خبر کو سُننے کے لیے

ہر رات میرے ہم وطن

بے تابی سے امیدوں کی سوئیاں گھماتے ہیں

اور ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں

اپنے امکان کی آواز سُننے کے لیے

دھک دھک ! دھک دھک !

انسان کا دل حرکت کر رہا ہے

نئے دن کی خبر سُناتا ہُوا

میرے دیس میں یہ خبر ضرور سینسر ہو جائے گی

کوڑھ مغز ـــــ احمق !!

بس اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے

طلوعِ آفتاب کی خبر چُھپائی نہیں جا سکتی

دن چڑھے گا تو دُنیا دیکھے گی

کیوں تمھاری بستی میں رات چھاتی رہے ؟

شب پرستوں نے تمھارا سُورج

کس اندھے کُنوئیں میں گرا دیا !!

مِل جُل کر اسے باہر کھینچ لو

پُورا زور لگا کر

آہستہ آہستہ

اور پھر — ایک زور دار جھٹکے کے ساتھ

کروڑوں بانہیں بَل کھا کر رسّی بن جائیں

کروڑوں ہانپتی سانسیں تمھارا رزمیہ گائیں

اور وقت کی منڈیروں پر کھڑے

تمھارے بچّے

مجبوریوں سے پتھرائے دِلوں کے

آخری نرم گوشہ میں

تالیاں بجاتے ناچ اٹھیں

اِک بار تو کِھل کِھلا کر ہنس دیں

تمھارے پامال بچپن بھی

بیتے سمے کی گپھاؤں میں

ان کی کلکاریاں گونجتی چلی جائیں

انقلاب کا سُرخ آفتاب

ہمارے بچّوں پر مسکرائے گا

سنہری آنکھیں ٹمٹماتا ہُوا

وُہ اُن کے ہاتھوں میں

رنگین تصویروں کی کتاب بن جائے گا

اور ننھّی سی سُرخ موٹر بن کر دوڑے گا

انھیں نئے زمانوں کی سَیر کراتا ہُوا

انسانیت کے روشن دَور کا آغاز ہونے کو ہے

آزادی ، انصاف ، مساوات

یہ لفظوں کے خالی گملے

تم ہی تو اپنے بیلچوں سے ان میں معنی بھروگے

دانائی کی نرم بھربھری مٹّی ڈال کر

ایک نئے سماج کا بیج بوؤگے

ہم فرشتے نہیں بن جائیں گے

ہم — سیدھے اور پیچیدہ انسان

لڑیں گے جھگڑیں گے

رُوٹھیں گے اور منائیں گے

انسان ہی تو رہیں گے

مگر

ابلیسیت کو کھُل کھیلنے کی چھُوٹ نہ ہوگی

ہم اسے مُلک بدر کرنے والے ہیں

لُوٹ کھسوٹ کے باولے درندہ کو

چوراہے پر شُوٹ کیا جائے گا

دفن کر دیں گے ہم اسے

اتنی گہری قبر کھود کر

ہماری حسین اور معصوم دھرتی پر

پھر کبھی وہ اپنے نجس پَیر نہ دھر سکے گا

ممکن تو یہی ہے اے باغباں

ہزار گلابوں کا چمن کِھلے

بارش کی بوچھاڑ میں

اور ایک شاخچہ بھی تشنہ نہ رہے

مَیں اسی دن کے لیے گاتی ہُوں

گاتی رہوں گی

ہر آخری گیت ، اُمید کا گیت

یہ شاعر کے دِل کا فرمان ہے

سو ، اے میرے دل

میرے شاہ زادے

تیرے حضور میں

مُسکرا کر ہاتھ باندھے

حاضر ہے میری شاعری

ہمرکاب

اِنتساب

شاید کہ قولِ خاک سے ہارا قلم مرا
تا عمر صرفِ حرفِ تمنّا رقم کیا

جی کو یہ ضد کہ آج تو خوں ناب روئیے
یہ قطرۂ سرشک سے بُوٹے بنا گیا
پت جھڑ میں ضد رہی کہ لکھے نو بہار رنگ

تقدیر تو سیاہ تھی تحریر کی مری
یہ اُس کا حوصلہ ہے کہ چھُوٹے ہزار رنگ
کیا بے قرار رنگ !

خفیہ ملاقاتیں

یہیں اسی دشت کے کنارے
جہاں سفیدوں کے جُھنڈ ہیں
اور جھیل پر کُہر چھایا ہُوا ہے
وہ مُجھ سے مِلنے آتے ہیں
وہ مُجھ سے چُھپ کر ملتے ہیں
خیال و خواب کی طرح
وہ میرا چہرہ پُرنم آنکھوں سے
دیر تک تکتے رہتے ہیں
اور سناٹا توڑتی ہے
اچانک کسی ٹہنی کے چٹخنے کی آواز

یا چُرمراتی گھاس
کِسی جانور کے سُم کے نیچے

کئی سال سے لگاتار
وہ چُھپ کر مجُھ سے ملاقات کرتے ہیں
مجُھ سے ملاقات چُھپ کر ہی ممکن ہے
دِل میں گھرے دبے راز
یا سختی سے دبائی خواہش کی مانند

کبھی کبھی
وہ مجُھ سے مِلنے نہیں بھی آتے
مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں
ترک کیے ہُوئے ارادے کی مانند
تب میَں خود چلی جاتی ہُوں
اپنا آپا انھیں دکھانے

وہ جھنجھلا کر مجھے دیکھتے ہیں
الزام کی پُر زور تردید کی طرح

سرزنش کے الفاظ

ان کے ہونٹوں سے آنسوؤں کی طرح گرتے ہیں

لیکن

اگر مَیں رو پڑوں

تو سب کچُھ بھُول بھال

وہ مجھے تسلّی دینے لگتے ہیں

کچُھ بھی ہو

وہ مجھے اپنے لیے مضبوط اور طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں

سو مَیں ویسی ہی رہوں گی

اور یونہی چھُپ کر ان سے ملتی رہوں گی

یہاں تک کہ وہ مجھے

اپنے ساتھ لے جائیں

ساون

اے کوئے دلدار
تجھ پر فدا ہو
یہ موسمِ گل
یہ ابر یہ باد
یہ عمرِ ناشاد

کس کو بتائیں
کیوں بن گیا ہے
معمورۂ دل
قریۂ برباد

اے کوئے دِلبر
ہے دِل کی قندیل
صَرصَر کی زد پر
کب سے دَھری ہے
بجھنے نہ پائے

کیا تیل اس کا
کیا اس کی باتی
آشا نراشا
سائے ہی سائے

کیا یاس کیا آس
سب حرف بے کار
اے کوئے دلدار

رانا تمھاری کارن کسی نے
کاک محل کے کاگ اُڑائے

طفلاں کی تو کچھ تقصیر نہ تھی

اے دوست پُرانے پہچانے

ہم کتنی مدّت بعد مِلے

اور کتنی صدیوں بعد ملی

یہ ایک نگاہِ مہر و سخا

جو اپنی سخا سے خود پُرنم

بیٹھو تو ذرا

بتلاؤ تو کیا

یہ سچ ہے میرے تعاقب میں

پھرتا ہے ہجومِ سنگ زناں؟

کیا نیل بہت ہیں چہرے پر؟

کیا کاسۂ سر ہے خون سے تر؟
پیوندِ قبا دشنام بہت
پیوستِ جگر الزام بہت
یہ نظرِ کرم کیوں ہے پُرغم؟

جب نکلے کوُئے ملامت میں
اِک غوغا تو ہم نے بھی سُنا
طِفلاں کی تو کچُھ تقصیر نہ تھی
ہم آپ ہی تھے یوں خود رفتہ
مدہوشی نے مہلت ہی نہ دی
ہم مُڑ کے نظارہ کر لیتے
بچنے کی تو صورت خیر نہ تھی
درماں کا ہی چارہ کر لیتے
پَل بھر بھی ہمارے کارِ جنُوں
غفلت جو گوارہ کر لیتے

اب اتنی رات گئے اے دِل!

اب اتنی رات گئے اے دِل!

کیا بات ہو ڈوبے تاروں سے

سب تارے تھک کر روٹھ چکے

جی چھوٹ چکے

دِل ٹوٹ چکے

جو اپنے بخت کے تارے تھے

بے چارے تھے

سو ڈوب چکے

جُز تیرہ شبی اب کیا ہے یہاں

پھر اندیشوں کا وقت کہاں

اب رات اندھیری ہے اے دِل!

یہ گھڑی تو تیری ہے اے دِل!

اب اس کے سوا کیا چارہ ہے

جبریل صفت پھر آئے صبا

پھر چاک ہو تن، شق ہو سینہ

اور کف پہ تڑپتا آئے نظر

پھر تیری رگِ جاں کا احمر

اے دِل پھر تُجھ کو تھام کے ہم

پڑھتے ہیں طلسمِ اسمِ وفا

گردش میں تجھے پھر لاتے ہیں

اے دِل! اے جامِ جہاں نما

ترسی ہُوئی آنکھوں پہ کُھل جا

دِکھلا ہر منظر نادیدہ

اب دیر نہ کر دِکھلا دِکھلا

کِس طور چمن کِھل جائیں گے

سارے بچھڑے، مل جائیں گے

سب طوقِ گلو کٹ جائیں گے

خُونی پہرے ہٹ جائیں گے

لَوٹیں گے بسیروں کو طائر

بسرام کریں گے جی بھر کر

دُشنام سُنے ہیں مُدّت تک

آرام کریں گے جی بھر کر

جب اتنی رات گئی اے دل

اب تیرے سوا کیا چارہ ہے

اب تُو ہی طبیب ہمارا ہے

اے دِل، اے دِل.....

جب نہیں چین

جب نہیں چین کسی کل پایا
سنگ سے مَیں نے سر ٹکرایا

اور سُنی
پتّھر کی بشّاش ہنسی

اپنے اشکوں میں غلطیدہ سُنتی تھی مبہوت کھڑی
پتّھر کی تہہ دار سلوں میں کئی بار گونجار ہُوئی
دل کو بسری دل کی دہشت
کون و مکاں تھے ہُو کی صُورت
مُورت سی مَیں وُہیں گڑی!

اس کے دَر تک کیوں آئی تھی
اس سے مجھ کو کیا کہنا تھا
ساری باتیں بھُول گئی
جب مَیں نے کانوں سے سُنی
پتھّر کی بے فکر ہنسی

بعد میں جو کچھ یاد رہا

کچے نیل سے رنگ کا گنبد...
گنبد کے نیچے تالاب
جھل مل پانی، عکس سحاب
(بعد میں جو کچھ یاد رہا کچھ ٹکڑے تھے تصویروں کے)

اس دن بارش برسی تھی
تازہ رنگ بھرا تھا ہر سُو جیسے کسی مصوّر نے

گنبد کے اندر سنّاٹا
وقت نہیں جاتا تھا کاٹا

آخر دستک دی مَیں نے

چار طرف بھاری دروازے
دروازوں کے پیچھے کیا تھا؟
شاید حیرت کے پُتلے
کئی بار پھر مَیں نے پُکارا
میری بات سُنے جو آکر
کوئی ہے ــــــــ!

اپنی صدا بھی دی نہ سُنائی
آخر بات سمجھ میں آئی
گونج نہ تھی اس گنبد میں

مَیں گنبد سے باہر آئی
سارا منظر ویسا تھا
کچّے نیل سے رنگ کا گنبد
جب مَیں نے مُڑ کر دیکھا
گنبد کے نیچے تالاب

جھلمل پانی، عکسِ سحاب
پھر دو آنکھوں کے پردہ پر
سارا منظر پھٹ گیا
کرچی کرچی ہو کے گرا، اور پھر پانی میں بہہ نکلا

فلسطینی

(فلسطینیوں کی خانہ جنگی سے متاثر ہو کر)

شدّتِ غم نے فلسطینی کو دیوانہ کیا

پارہ پارہ کر کے اپنے ننگ کا بوسیدہ بر
اپنے ناخن کر کے پیوستِ گلو
اپنا پنجہ اس نے اپنے ہی لہو میں بھر لیا

اپنی لاشیں ، اپنے قاتل ، اپنی گور ، اپنے کفن
اپنا دامن ، ہاتھ اپنے ، اپنا کف ، اپنا دہن
ہاں یہی ہے ، ہاں یہی ہے عالمِ دیوانہ پن

وہ یتیمِ ارض تھا

راندۂ درگاہِ عالم، بے سہارا، بے خطا
سازشوں کی رات میں شب خُون کا مارا ہُوا
نرغۂ اعدا میں بے جگری سے سرگرمِ ستیز
حلقۂ احباب میں تنہا رہا
دُشمنی اور دوستی کے وار سب سہتا رہا
اُس کے زخمی کاسۂ سر سے لہُو بہتا رہا
اُس کا دل دُنیا کے دل سے جانے کیا کہتا رہا

آخرش دونیم ہو کر رہ گیا اس کا دماغ
ریزہ ریزہ ہو گیا اس کا ایاغ

آہ لیکن بوجھ ہے ہر رات کے آرام پر
ان پناہ گاہوں سے بھیجے طعنۂ و دشنام پر
دُور صحرا میں کسی کے سر پٹکنے کی صدا
شدّتِ غم نے فلسطینی کو دیوانہ کیا

نذرِ فیضؔ

(یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے)

یہ مرحلہ بُوئے گُل سا نازک
یہ ساعت، عرقِ سال و مہ کا
یہ وصلِ مدام کی گھڑی ہے

اے درد بدوش، خانہ برباد
جادہ نہ ترا نہ کوئی منزل
جُز دیدۂ آب گوں وطن کے
جُز خلقِ وطن کا خونچکاں دل

ڈالے ہیں جہاں جہاں پڑاؤ
تھیں خیمہ فگن وہی نگاہیں

سانسوں کی طرح پلٹ کے آئیں
اس حبس میں تری صدائیں

تم سرخ محل میں آ براجے
بے سُود رہی نگاہ داری
تھا پارۂ شعر، پرزۂ جاں
پروانۂ حقِ راہداری

اب یوں ہے کہ ہر عدُو سے محفوظ
باہر شب خوں کی دسترس سے
مامون حصارِ عاشقاں میں
تم منزل پا چکے ہو کب کے

اب آؤ نہ جاؤ گے کہیں تم
اے دربدری میں رشکِ انجم
کیا سخت غنیم پر پڑی ہے
یہ وصلِ مدام کی گھڑی ہے

نذرِ فراق

اے دلِ کافر، عجز سے مُنکر، آج ترا سر خم کیوں ہے
تیری ہتھیلی شریانوں میں، یہ بے بس ماتم کیوں ہے
آنکھ تو رونا بھول گئی تھی، پھر ہر منظر نم کیوں ہے

مت روکو بہتے دو آنسو، کسی کو کرتے ہیں پرنام
آپ جھکا ہے جھکنے دو سر، چھپا تھا اس میں کوئی سلام
شاید اس کے حضور میں ہو تم جس کو کہتے ہیں انجام
یہ ہستی کی سرحدِ آخر ہُوا جہاں ہر سفر تمام
بے بس ہے انساں بے بس ہے تکتی رہ گئی روتی شام
اُٹھ گیا کوئی بھری دُنیا سے باقی رہے خُدا کا نام
یا پھر کاغذ پہ پرچھائیں، مِلے گا جس کو ثبُتِ دوام
یہ ٹکڑے انسانی دِل کے، شاعر اور شاعر کا کلام

ناز کروں گی خوش بختی پہ میں نے فراقؔ کو دیکھا تھا
اُجڑے گھر میں دو تہذیبوں کے سنگم پہ بیٹھا تھا
گرم ہم آغوشی صدیوں کی ہو گی کتنی پیار بھری
جس کی بانہوں میں کھیلی تھی اس کی سوچ کی سندرتا
شعر کا دل شفاف تھا اتنا، جیسے آئینۂ تاریخ
کیا بھرپور وصال تھا جس نے اس شاعر کو جنم دیا

گر تاریخ نے پاگل ہو کر خود اپنا سر پھوڑا ہے
خون اُچھالا ہے گلیوں میں اپنا ہنڈولہ توڑا ہے
چھینٹ نہ تھی دامن پر اس کے کون گھاٹ دھو بیٹھا تھا
جسے سمجھتے ہو ناممکن وہ اس انساں جیسا تھا
اِنساں بھی اتنا معمولی، جیسے اپنا ہمسایہ
اپنے شعر سُنانا اس کا اور خود حیراں ہو جاتا
باتوں میں معصوم مہک تھی، آنکھوں میں بے چین لپک
خاموشی کے وقفے یُوں، جیسے اُس نے کچھ دیکھا تھا
پیڑ بہت جھیلی تھی اُس نے اتنی بات تو ظاہر تھی
لہجہ میں شوخی تھی جیسے راکھ میں چمکے انگارہ

سنگم کے پانی پر میں نے دیکھی تھی کیسی تصویر
اُڑا ابلیک کر اک جل پنچھی کھینچ گیا پانی کی لکیر
جمنا کی نیلی گہرائی، بھید بھری چُپ سے بوجھل
گنگا کے دھارے کی جنبش، اُجلی طاقت و بے کل
اس پانی میں عکس ڈالتا آسمان کا اک ٹکڑا
مٹّی کے بُت، ہرے ناریل، چندن لگا کوئی مکھڑا
دو دھاروں پر ناؤ کھیتا سوکھا پنجر مانجھی کا
دان کے پیسے گنتا پنڈت تانبہ سورج سانجھی کا
جمنا پر مینار قلعہ کے گنبد کا ترچھا سایہ
پاکستان سے آئے مہاجر گیندے کی ٹوٹی مالا

پانی میں چپّو کی شپ شپ، باتوں کے ٹوٹے ٹکڑے
'یہیں کہیں پر ہم سے اوجھل سرسوتی بھی بہتی ہے'

جو سمجھی، جو آگے سمجھوں، چھلک رہا ہے دل کا جام
وہ منظر جو خود سے بڑا تھا، اس کا گھیر تمھارے نام

یہ کمرے کا ماند اُجالا، باہر ہُوک پپیہے کی
کھڑکی پر بوندوں کی دستک، سانسیں بھرتی خاموشی
پُوری بات نہیں بتلاتا گونگے آنسو رو دینا
تیری دھرتی سہہ نہ سکے گی اتنے حُسن کو کھو دینا
تنہا اور اپاہج بوڑھے تجھے نہ مرنے دیں گے لوگ
ابھی تو جیون بانجھ نہیں ہے، پھر تجھ کو جنمیں گے لوگ

تحسین

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم
حافظ

لاریب لسان الغیب ہو تم
تحسین! کہ جو کھینچا منظر
تم کیسے یُگ میں جیتے تھے سجن!
پلٹا ہے وہی، پر تمھرے بن
دُہی فتنہ و شر، وہی روزِ بتر
دُہی طوقِ طلاء، وہی گردنِ خر
ابلہ کے لیے وہی شربتِ گُل
دانا کی روزی خونِ جگر

وہی خونِ جگر، وہی دیدۂ تر

بے رحم برادر ویسے ہیں

وہی گربۂ عابد سجدے میں[1]

وہی کبکِ دری کے بکھرے پر

وہی تا بہ فلک بنیادِ ریا

کچھ فرق ہے گر

بس اتنا ہے

نہیں آپ سا کوئی بھی اہلِ نظر

باقی سب کچھ پھر ویسا ہے

یا کچھ بڑھ کر

---

[1] اے کبکِ خوش خرام کہ خوش می روی بناز
غرہ مکن کہ گربۂ عابد نماز کرد!
حافظ

پوروا آنچل

(مشرقی یوپی کرفیو میں)

یہ دھرتی کتنی سُندر ہے!
یہ سُندر اور دُکھی دھرتی
یہ دھانی آنچل پُورب کا
تیز رفتار ریل کے ساتھ
ہوا میں اُڑتا جاتا ہے
پڑا جھل مل لہراتا ہے

دُور تک ہرے کھیت کھلیان
یہ دھرتی عورت کوئی کسان
سنبھالے سر پر بھاری بوجھ
چلی ہے کھیت سے گھر کی اور

وہی گھر جس کی چھت پر آج

گردھ کا گِدھ منڈراتا ہے

جھپٹ کر پَر پھیلاتا ہے

اوس سے گیلا ہے سبزہ

کہ گیلے ہیں میرے دو نَین

پڑے ماٹی پتّھر کے ڈھیر

وہی مسجد مندر کے پھیر

تنے لوگوں کے تیور دیکھ

اسی دھرتی[1] پر سویا سپوت

جاگ کر تمھیں مناتا ہے

کبیرا کچھ سمجھاتا ہے

جہاں ہوں نفرت کے گھمسان

نہیں رہتے اس جا بھگوان

نہیں کرتا ہے نظر رحیم

نہیں کرتے ہیں پھیرا رام

---

[1] : مگھر ـــ کبیر کی آخری آرام گاہ (مشرقی یوپی)

تمھاری منّت کرتا ہے
خاک پر سیس جُھکاتا ہے
کبیرا کچھ سمجھاتا ہے

اسی سرجو[1] ندیا کے پار
کمل کنجوں پر جہاں بہار
کھڑے ہیں ہرے بانس کے جھنڈ
گڑا ہے گوتم کا ستدلیش
کِھلے ہیں جہاں بسنتی پھول
کُھدا ہے پتھّر پر اُپدیش

'اڑے جب دو فرقوں کی آن
تُلے ہوں دے دینے پر جان
ہے اصلی جیت کی بس یہ ریت
کہ دونوں جائیں برابر جیت'

ہُوئی جس یُدھ میں اِک کی ہار

---

۱ : کُشی نگر — گوتم بُدھ کی انتم سمادھی (مشرقی یوپی)

وہ ہوتا رہے گا بارم بار
نہ دونوں جب تک مٹ جائیں
نہ دونوں جائیں برابر ہار'

یہی ٹکراؤ کا ہے قانون
یہی گوتم کا اُتّم گیان
کہ جس کے آگے ایک جہان
ادب سے سیس جُھکاتا ہے
تمھی تو وارث تھے اس کے
تمھیں کیوں بسرا جاتا ہے

سجے رہنما کے سر دستار
پڑیں پانڈوں کے گلے میں ہار
جلے ہیں جن کے چُولھے روز
بھرے ہیں جن کے سدا بھنڈار
ارے تو مُورکھ کیوں ہر بار
جان کر دھوکا کھاتا ہے!
لہُو میں آپ نہاتا ہے

———

مفرور

کہیں تو ڈھونڈو سُراغ ان کا

کہاں ہے دل اور دماغ ان کا

ابھی تمھارے محاصروں میں گھرا ہے تاراج باغ اُن کا

وہیں کسی راہ پر کچھی اُن کی چشمِ نم ہے

کٹا ہُوا ہاتھ آج بھی بستۂ قلم ہے

گلوئے زیبِ رسن سے لپٹی ہیں ان کی بانہیں

جو گھر سے نِکلے، کہ جیسے دھرتی کے لال سے آہیں

جہاں تھے مسدود سارے رستے

وہیں پہ اُن کے قدم گڑے ہیں

تمھارے بوٹوں تلے وہیں ان کے دل پڑے ہیں

بس ایک دل تھا، بس ایک جاں تھی

نہ اتنی یکتا

کہ تلملانے لگیں شکنجے

مزاجِ حاکم ہو اتنا برہم!

مگر کوئی صیدِ نورسیدہ، شکارِ تازہ

تمھارے جنگل کی زد سے باہر نکل گیا کیا؟

بلند سر بے کسوں کی حرمت

یہی تو تھی جسم و جاں کی قیمت

متاعِ انمول ہاتھ آئی

لپیٹ کے دامن سے ساتھ آئی

دبی گھٹی آہ چیخ بن کر ضمیرِ عالم ٹٹولتی ہے

بہت نمک خوار مضطرب ہیں کہ برملا راز کھولتی ہے

یہ غیرتِ خاک ہے

کہ جو میرے نطق میں ڈھل کے بولتی ہے

مظفؔر وارثی کی تخلیقات

برف کی ناؤ ——— غزل
بابِ حرم ——— نعت
لہجہ ——— غزل
نورِ ازل ——— نعت
الحمد ——— حمد و ثنا
حصار ——— نظم
لہو کی ہریالی ——— گیت
ستاروں کی آبجو ——— قطعات
کعبۂ عشق ——— نعت
کھلے دریچے بند ہوا ——— غزل
کلیاتِ مظفؔر وارثی ——— تمام کتابوں کا مجموعہ
زیرِ اشاعت

فتنہ سامانیٔ دل	کشور ناہید
سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ	〃 〃
میں مٹی کی مورت ہوں	فہمید ریاض
ناگزیر	محسن احسان
بربط و جام	عدم
نعشِ جنوں	محسن حیات آثر
بکھر جانے کی رُت	شہزاد احمد
آنکھوں میں تیرے سپنے (گیت)	امجد اسلام امجد
کجلی بن	سعادت سعید
تیرِ حرم	بیچین رامپوری
نیکیوں سے خالی شہر	جاوید شاہین
سورج کا ہم سفر	اعجاز فاروقی
قلب و نظر کے سلسلے	قیوم نظر
لہو کی ہریالی	مظفر وارثی
ستاروں کی آبجو (قطعات)	〃
کھلے دریچے بند ہوا (غزل)	〃
چینی شاعری	یحییٰ امجد
خواب در خواب	خاطر غزنوی
کلیاتِ میر	میر تقی میر
کلیاتِ سودا	سودا